www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

دسمبر 2021

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

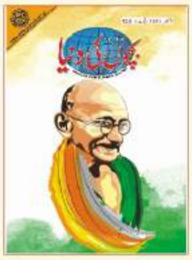

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیاہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے　سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 12 دسمبر 2021

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم بحکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع : ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقامِ اشاعت : دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64
■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL)
اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	1
شخصیت	بلبل دکن پروفیسر فاطمہ پروین	ڈاکٹر عزیز سہیل	5
جہانِ نسواں	راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقات میں پنجابیت کی جھلک	ڈاکٹر رشید جہاں انور	11
	قرۃ العین حیدر کا فن اور 'جلاوطن'	ڈاکٹر محمد شفقت کمال	14
	بہار کی خواتین افسانہ نگار	ریحانہ پروین	19
	اردو ادب میں خواتین کا کردار	صبا زہرا رضوی	23
	عابد سہیل کی صحافت: ماضی اور حال	صبا	26
	ندا فاضلی کے رپورتاژ 'جشن شاعر' پر ایک نظر	نصرت جہاں	29
نکہتِ سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		34
افسانہ	جنت ارضی	ڈاکٹر رینو بہل	35
	احساس	رخسانہ نازنین	40
	آزمائش شرط ہے	سیدہ ایمن عبدالستار	42
	اولڈ ایج ہوم	کے فرحت جبین	48
حسنِ سخن	ڈاکٹر جوہی بیگم، ڈاکٹر ہاجرہ خاتون		52
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		54
صحت	اینٹی آکسیڈنٹس: قدرت کی اکسیر	ڈاکٹر صدف کلام	56
آرائش وزیبائش			60
تاثرات	نگر نگر سے		62

مشعل

گزشتہ ایک ڈیڑھ سال میں ہمارے درمیان سے سینکڑوں شخصیات رخصت ہو چکی ہیں اور اپنے پیچھے ایک خلا چھوڑ گئی ہیں۔ خاتون ادیبوں کی ایک بڑی تعداد بھی داغ مفارقت دے گئی ان میں ترنم ریاض، تبسم فاطمہ، شمشاد جلیل، سعدیہ دہلوی اور فاطمہ پروین جیسے معتبر و مستند نام ہیں جو شعر و ادب سے جڑے ہوئے تھے۔ ان شخصیات نے اردو ادب کا دامن اپنے وسیع مطالعے سے مالا مال کیا اور اردو زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اپنے مطالعے کے ذریعے انسانی فکر اور زبان اردو کی فنی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی نہ صرف کامیاب سعی کی بلکہ زبان کے دائرے کو وسیع بھی کیا۔

ان شخصیات کے بچھڑنے سے ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے جس کو پر کرنا آسان نہیں۔ انھوں نے بیش قیمتی علمی اور ادبی سرمایہ چھوڑا ہے ان کا تحفظ کیسے کیا جائے یہ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ان خواتین نے گھروں میں اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے جو کوششیں کیں وہ قابل ستائش ہیں۔ اب یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ ہم اپنے گھروں میں اس زبان کو زندہ رکھیں اس کے لیے ہمیں اپنے بچوں کو اردو زبان کی تعلیم پر زور دینا ہوگا۔ والدین اگر خود زبان کا تحفظ چاہتے ہیں تو انھیں اپنے گھروں میں اپنے بچوں کو اردو زبان پڑھانے کی طرف راغب کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہی بچے آگے چل کر اردو زبان و ادب کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنائیں گے اور ایک نئی نسل اردو کی ترویج و اشاعت میں اپنی خدمات انجام دے گی اور ادب کے مختلف میدانوں میں وہ اپنی دلچسپی اور اپنے ذوق کے ذریعے نمایاں کارنامے انجام دے سکے گی۔

ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اردو زبان کی آبیاری کے لیے نئی نسل کو اس طرف متوجہ کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے درمیان ایسے لوگوں کی تربیت کرنی ہوگی جو زبان سے محبت کرتے ہیں اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ جب تک وہ زبان سے اپنی حقیقی وابستگی کا اظہار نہیں کریں گے تب تک زبان کا تحفظ ممکن نہیں ہے۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے ان کو اردو زبان سے محبت اور بے لوثی اور بے غرضی کا جذبہ رکھنا ہوگا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اسلاف کے کارناموں پر نگاہ رکھیں اور ان کی کتابوں سے رشتہ استوار کریں۔ اس سے اردو زبان کو تازگی ملے گی اور زبان میں وسعت پیدا ہوگی جو لوگ اردو زبان سے جڑے ہوئے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی۔ اردو کے لیے جو اقدام وہ کر رہے ہیں ان کی ستائش کرنی چاہیے۔ ان کے مشن اور وژن کی تعریف کرنی ہوگی تا کہ اردو زبان کو تقویت مل سکے۔ ایسے افراد جو اردو سے سچی محبت کرتے ہیں ان کے کام کی وقتاً فوقتاً تعریف کی جانی چاہیے تا کہ انھیں مزید حوصلہ مل سکے۔ اردو سے تعلق رکھنے والی شخصیات کی خدمات کا اعتراف بھی کرنا ہوگا تا کہ ان کی صلاحیتیں مزید نکھر کر سامنے آسکیں۔ محبان اردو کو جو بھی مسائل درپیش ہیں ان کو دور کرنے کے لیے ہمیں کوشش کرنی ہوگی اور ان کے لیے نئی زمینیں بھی ہموار کرنی ہوں گی تا کہ ان کی راہیں مزید آسان ہو سکیں۔ اردو زبان کا تحفظ کسی ایک ادارہ، تنظیم، سوسائٹی یا شعبہ کی نہیں بلکہ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر عزیز سہیل

بلبل دکن
پروفیسر فاطمہ پروین

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ایسی عظیم مادر علمیہ ہے جس نے زندگی کے تمام شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے کئی انمول رتن پیدا کیے۔شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ سے وابستہ اساتذہ بھی اردو تحقیق وتنقید، دکنی علوم کے فروغ اور اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے والوں میں پیش پیش رہے ہیں۔اساتذہ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میں درس وتدریس، تحقیق وتنقید اور فروغ اردو کے حوالے سے یکساں طور پر جن کو صاحبان علم وادب کا بلند مقام حاصل ہوا ہے ان میں ایک اہم نام پروفیسر فاطمہ بیگم (پروین) کا بھی ہے۔جو حیدرآباد کے علمی وادبی افق پر اپنے زور خطابت، تبحر علمی اور لیاقت اور دانشوری کے سبب بلاشبہ بلبل دکن کہلانے کی مستحق تھیں۔پروفیسر فاطمہ پروین 30 دسمبر 1953 کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں، آپ کے والد جناب سید محمد علی صاحب طوبی محکمہ آبکاری میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے، وہ شعر وادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے، آپ کی والدہ رضیہ بیگم شاعرہ تھیں وہ ریاضت تخلص کرتی تھیں، ان کے شعری مجموعے 'اشک غم اول'، اشک غم دوم، مراثی کے مجموعے، خمسہ مراثی، مشاہدۂ غم، اور چشم غم شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔پروفیسر فاطمہ پروین کا تعلق ایک علم پرور گھرانے سے رہا ہے۔ان کی ابتدائی تعلیم بھی اچھے انداز میں ہوئی، انھوں نے میٹرک اور انٹر میڈیٹ کی تکمیل کے بعد اعلی تعلیم کے لیے جامعہ عثمانیہ کا رخ کیا اور 1972 میں یہاں سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی، انھوں نے اپنے تعلیمی سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے ، ایم اے اردو میں داخلہ لیا اور 1975 میں امتیازی کامیابی حاصل کرتے ہوئے گولڈ میڈل حاصل کیا، تعلیمی سفر یوں ہی جاری رہا 1979 میں ایم فل کامیاب کیا، ایم فل کی کامیابی کے بعد جامعہ عثمانیہ سے ہی پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا جہاں ان کے مقالہ کا موضوع ''غواصی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' تھا 1989 میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔

پروفیسر فاطمہ پروین صاحبہ کی شادی 1980 میں جناب ڈاکٹر محمد مجید اللہ صدیقی سے ہوئی وہ سنگھی کالج آف کامرس اینڈ سائنس میں وائس پرنسپل تھے۔ان کے شوہر مجید اللہ صدیقی ایک اچھے شاعر تھے جن کا شعری مجموعہ ''درد کے اتھاہ سمندر میں'' اردو حلقوں میں کافی مقبول ہوا تھا۔آپ کو اللہ رب العزت نے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔

پروفیسر فاطمہ پروین کے تدریسی سفر کا آغاز 1976ء میں بحیثیت جونیئر لیکچرر اردو عمل میں آیا انھوں نے جونیئر لیکچرر کی حیثیت سے 14 سال تک خدمات انجام دی، 1990 میں آپ کا تقرر بحیثیت لیکچرر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں ہوا۔آپ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے 1997ء میں بطور ریڈر ترقی دی گئی اور 2005 میں پروفیسر کے عہدے پر ترقی ہوئی۔2006 میں چیئر پرسن بورڈ آف اسٹڈیز مقرر ہوئیں۔کچھ عرصہ بعد صدر شعبۂ اردو بنائی گئیں۔2012ء میں بحیثیت وائس پرنسپل آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی

کے ترقی دی گئی ان کے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔30 دسمبر 2013 کو وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئیں۔سبکدوشی کے کچھ عرصہ بعد امبیڈکر اوپن یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں برسرکار رہیں۔27 اگست 2021 بروز جمعہ صبح 9 بجے، مختصر سی علالت کے بعد ان کا انتقال ہوگیا گویا اردو سمیناروں اور ادبی اجلاسوں میں گونجنے والی بلبل دکن کی یہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

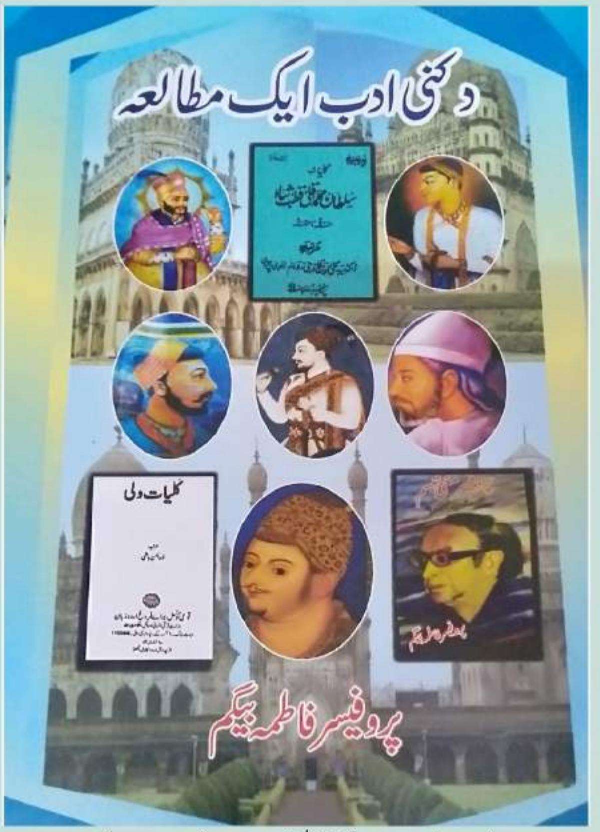

پروفیسر فاطمہ پروین کی پہلی تصنیف ”اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ“ 1980 میں شائع ہوئی۔ان کی دیگر تصانیف میں کربِ کربلا، زاویہ نگاہ 2005، ننھی نظمیں (تلگو سے ترجمہ)، کلاسیکی شاعری کا مطالعہ 2009، اشک غم، دکنی ادب کا مطالعہ 2019، پروفیسر مغنی تبسم ایک روشن چراغ تھا نہ رہا‘ 2019 شامل ہیں۔ان کی تصانیف کو اردو اکیڈمی آندھراپردیش، تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈمی، مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے انعامات سے نوازا ہے۔2011 میں اردو اکیڈمی آندھراپردیش کی جانب سے انھیں یونیورسٹی اساتذہ کے زمرے میں ”بسٹ ٹیچر ایوارڈ“ سے نوازا گیا۔2013ء میں اردو اکیڈمی آندھراپردیش نے ان کے علمی وادبی خدمات کے پیش نظر باوقار کارنامہ حیات ایوارڈ عطا کیا۔ان کے علاوہ دیگر اداروں اور انجمنوں کی جانب سے ان کی خدمات کے اعتراف میں انعامات واعزازت سے نوازا ہے۔محترمہ فاطمہ پروین صاحبہ نے ملک و بیرون ملک مختلف سمیناروں اور ورکشاپ میں عثمانیہ یونیورسٹی کی نمائندگی کی ہے۔انھوں نے لندن کا بھی علمی سفر کیا ہے۔پروفیسر فاطمہ پروین کی خدمات کے اعتراف میں ایوان فنکار اور گواہ اردو ویکلی کی جانب سے 2014 میں ”بلبل دکن“ کا خطاب عطا کیا گیا۔

پروفیسر فاطمہ پروین کی شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن تھیں۔فرد کی صلاحیتیں خدا کی ایک عظیم نعمت ہے اور شخصیت کی تعمیر میں خاندان کا اثر بھی نمایاں ہوتا ہے، پروفیسر فاطمہ پروین کو اللہ رب العزت نے متنوع صلاحیتوں سے نوازا ہے، ساتھ ہی ان کا تعلق ایک علمی گھرانے سے رہا ہے جس کے اثرات ان کی تعلیم وتربیت پر مرتب ہوئے ہیں ان کی شخصیت کو ہم بحیثیت استاد، محقق، نقاد، مترجم، مقرر اور بحیثیت منتظم کے دیکھ سکتے ہیں۔

بحیثیت استاد:

پروفیسر فاطمہ پروین کا تدریسی سفر کافی طویل رہا ہے انھوں نے 1976 میں بحیثیت جونیئر لیکچرر کے اپنی تدریسی خدمات کا آغاز کیا تھا جو 2013ء تک جاری رہا اپنی ملازمت کے دوران انھوں نے اپنے پیشے کا مکمل طور پر حق ادا کیا اور پوری دیانت داری سے اپنی ذمہ داری کو انجام دیتی رہیں، وہ ایک خوش اخلاق نگراں بھی تھیں جن کی نگرانی میں درجنوں طالب علموں نے اپنا تحقیقی سفر مکمل کیا عموماً جامعات میں پی ایچ ڈی کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ریسرچ سپروائزر کا اپنے شاگردوں سے درست رویہ ہے، لیکن میرے علم کے مطابق جن تحقیق کاروں کو سوپروائزر کی حیثیت سے پروفیسر فاطمہ پروین کا ساتھ ملا ان کے بڑی آسانی کے ساتھ تحقیقی مقالے مکمل ہوئے اور ان کے شاگردوں نے ان سے آداب و اخلاق سیکھا، اس کی مثال میں خود بھی ہوں میں محترمہ کے رویہ سے اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ میں نے اپنے کام میں کوئی تساہلی نہیں کی اور وقت مقررہ پر اپنا کام مکمل کیا، حالانکہ اس وقت میڈم آرٹس کالج کی وائس پرنسپل تھیں اپنی مصروفیات کے باوجود انھوں نے کبھی مجھے واپس نہیں کیا اور نا کبھی سختی سے پیش آئیں وہ مجھے اپنے ماں کی طرح نصیحت فرماتیں اور میری خوب ہمت افزائی کرتیں تھیں، میری شخصیت کی تعمیر میں ان کا نمایاں کرادر رہا ہے۔میرے ساتھ ساتھ دیگر اسکالرس سے بھی میں نے سنا ہے کہ ان کا رویہ اپنے ہر ایک طالب علم کے ساتھ یکساں ہیں۔میرے پیشرو تحقیق کار ’ڈاکٹر جاوید کمال نے اپنے مضمون شفیق استاد، ہمدرد انسان، منکسر المزاج شخصیت پروفیسر فاطمہ پروین“ میں لکھا ہے:

”میری استاذ محترمہ پروفیسر فاطمہ پروین صاحبہ کا نام جب

بھی ذہن میں آتا ہے ایک شفیق استاد، ہمدرد انسان اور منکسر المزاج شخصیت کا پیکر ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور میرا سر احتراماً خود بخود جھک جاتا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ان ہی شفیق استاد ہی کی بدولت بڑی آسانی سے ڈاکٹر جیسا باوقار لفظ تادم حیات میرے نام کا جز بن گیا جس کی تمنا بیسوں اسکالرس کے دل میں ہوتی ہے''۔

(ڈاکٹر جاوید کمال، گواہ اردو ویکلی حیدرآباد، 7 تا 13 فروری 2014، ص 13)

ڈاکٹر سید فاضل حسین نے ''ممتا کا آنچل'' کے عنوان سے پروفیسر فاطمہ پروین پر مضمون لکھا ہے، جس میں بہت سے واقعات کو انھوں نے رقم کیا اور محترمہ کے الفاظ کو بطور نصیحت ممتا کے آنچل سے تعبیر کیا ہے۔ سید فاضل حسین پرویز نے پروفیسر فاطمہ پروین سے جو کچھ سیکھا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محترمہ سے جتنی بار ملنے کا موقع ملا ہر بار ان سے کچھ نہ کچھ سیکھا، رواداری، مروت، اخلاص، باہمی احترام، کسی سے اختلاف کے باوجود اسے اہمیت دینا۔ نہ تو کسی کو کمزور سمجھنا اور نہ اپنی کمزوریوں سے غافل رہنا، جو ذمہ داری قبول کی جائے اسے اتنی ہی ذمہ داری سے پوری بھی کی جائے استاد اور شاگرد کے درمیان باہمی اعتماد کا رشتہ کیسے برقرار رکھا جائے اور یہی میری پانچ سال محنت کا حاصل ہے''

(ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز، گواہ اردو ویکلی حیدرآباد، 7 تا 13 فروری 2014، ص 16)

بحیثیت محقق: پروفیسر فاطمہ پروین نے بیسوں تحقیقی کام انجام دیے جن میں ایم اے کا مقالہ ''اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' 1975، ایم فل کا تحقیقی مقالہ 'سترہویں صدی میں ہندالمانی عناصر' 1979 اور پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ''غواصی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' 1989 شامل ہیں، ان کے علاوہ دیگر تصانیف کی اشاعت اور سیکڑوں سمیناروں میں پیش کئے گئے مقالات اور مضامین شامل ہیں جو ان کے تحقیقی فکر اور شعور کو نمایاں کرتے ہیں، ان کے علاوہ محترمہ نے مختلف جامعات کی نصابی کتابوں کی ترتیب میں بھی کافی اہم کردار ادا کیا ہے۔

بحیثیت نقاد: پروفیسر فاطمہ پروین تنقیدی مزاج بھی رکھتی ہیں جہاں ایم اے اردو میں ان کی تحقیق کا آغاز ہوا وہیں ان کی تنقیدی صلاحیتیں فروغ پانے لگی جس کا اندازہ ان کی تصنیف ''اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' سے ہوتا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے پروفیسر فاطمہ پروین کے تنقیدی شعور سے متعلق لکھا ہے:

''فاطمہ پروین نہایت انہاک کے ساتھ اس کام میں لگی رہیں، انھوں نے تلاش اور جستجو سے اختر انصاری کی تقریباً سبھی تحریریں فراہم کیں اور طالب علمانہ لگن کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا پھر ہر صنف ادب کے فنی اصولوں کی روشنی میں معروضیت کے ساتھ ان کا تنقیدی جائزہ لے کر اختر انصاری کے ادبی مرتبے کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔''

(پروفیسر مغنی تبسم ''اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' مقدمہ، ص 9)

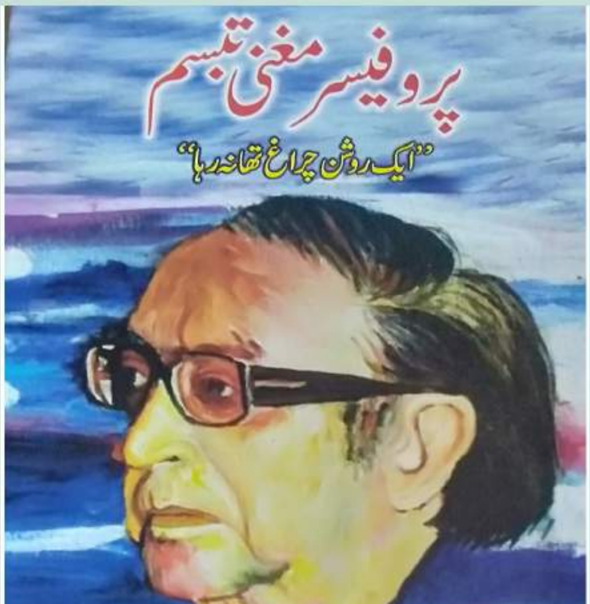

پروفیسر فاطمہ پروین نے اختر انصاری کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے انھیں جمال پرست شاعر قرار دیا ہے۔ ان کی تنقیدی فکر دیکھیں

''اختر انصاری ایک جمال پرست شاعر ہیں، کیٹس اور شیلی کی طرح انھوں نے زیادہ تر حسن و عشق کے گیت گائے ہیں۔ اپنی شاعری کے آغاز میں وہ ادب برائے ادب کے نظریے کے قائل تھے اور آج تک بھی وہ ادب اور شاعری کے جمالیاتی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں ان کے بیش تر قطعات حسن اور کیفیات عشق سے لبریز ہیں، اپنی بڑھی ہوئی جمال پرستی کا انھیں احساس بھی ہے''

(پروفیسر فاطمہ پروین ''اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' ص 99)

پروفیسر فاطمہ پروین کا تنقیدی سرمایہ کچھ زیادہ نہیں ہے ان میں اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، زاویۂ نگاہ، دکنی ادب کا مطالعہ شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی ان کتابوں میں جن تنقیدی موضوعات کا تجزیہ کیا اور بحث کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر تنقیدی ذہن ہے اور تنقیدی شعور بھی بہتر پایا جاتا ہے۔

بحیثیت مترجم: پروفیسر فاطمہ پروین نے ترجمہ نگاری کے بھی کام انجام دئے ہیں بحیثیت مترجم انھوں نے ڈاکٹر گوپی کی تلگو شاعری میں صنفِ سخن ''نانی لو'' کا اردو میں ترجمہ 'ننھی نظمیں' کے عنوان سے کیا ہے۔ پروفیسر مظفر شہ میری وائس چانسلر عبدالحق اردو یونیورسٹی پروفیسر فاطمہ پروین کی ترجمہ نگاری سے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''پروفیسر فاطمہ کے ترجمے کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اولاً من وعن ترجمہ، ثانیاً آزاد ترجمہ اور ثالثاً نئے ترجمے! من وعن ترجمہ میں پروفیسر فاطمہ نے لفظ بہ لفظ نظم کی روح کے ساتھ ترجمہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے تلگو الفاظ نکال کر ان کی جگہ اردو الفاظ رکھ دیے ہیں۔''

(پروفیسر مظفر شہ میری، پروفیسر فاطمہ پروین کی ترجمہ نگاری، گواہ اردو ویکلی حیدرآباد، 7 تا 13 فروری 2014، ص 14)

ننھی نظموں کے علاوہ بھی انھوں نے علمی ضرورت کے تحت بھی ترجمے کیے ہیں، بہر حال ان کے اندر ایک اچھے مترجم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں ترجمے کے مفہوم کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنا اور زبان وبیان کی نزاکتوں کو مدنظر رکھ کر ترجمے کیے ہیں۔

بحیثیت مقرر: تقریر سے متعلق کہا گیا ہے تقریر اس مہارت فن کا نام ہے جس کے ذریعے کوئی شخص کسی متعین موضوع، متعین وقت میں، مکمل، مسلسل اور موثر اظہار خیال کرسکتا ہے۔ تقریر کا یہ فن اللہ رب العزت نے خصوصی طور پر پروفیسر فاطمہ پروین کو عطا کیا ہے ان کی تقریر کو سن کر ہر کوئی حیران وششدر رہ جاتا ہے، الفاظ موتیوں کا روپ اختیار کرلیتے ہیں، جب وہ تقریر کررہی ہوتی ہیں تو الفاظ ایک تسلسل کے ساتھ زبان سے ادا ہوتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ ہاتھ باندھے کھڑے ہوں وہ ہر موضوع پر انتہائی بصیرت افروز اور سحر انگیز خطاب سے نوازتی ہیں کہ سننے والے عش عش کرنے لگتے ہیں۔ جب کسی موضوع پر وہ اپنی تقریر اختتام پر لے آتیں ہیں تو سامعین پوری طرح اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے نظام ٹرسٹ کی جانب سے 4 جون 2011 کو پرنس عیسن کالج پرانی حویلی حیدرآباد، آصف سابع نواب میر عثمان علی خان کی 129 ویں یوم پیدائش کے موقع پر منعقد یادگار لیکچر کے لیے پروفیسر فاطمہ پروین کو مدعو کیا گیا تھا، میں نے بھی محترمہ کو سننے کے لیے اس پروگرام میں شرکت کی۔ پہلا موقع تھا کے محترمہ کو ایک بہترین مقرر کی حیثیت سے سن رہا تھا اور ساتھ ہی رپورٹ بھی لکھ رہا تھا میں ان کی تقریر سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور اس پروگرام کی طویل رپورتاژ لکھ ڈالی، جس سے میری رپورتاژ نگاری کا آغاز ہوتا ہے اور چند سال بعد میری ایک تصنیف بھی اس صنف پر شائع ہوئی۔

پروفیسر فاطمہ پروین کی تقریر کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ سامعین کو اپنا قائل اور ہم نوا بنالیتی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق پروفیسر فاطمہ پروین نے اپنے ملازمت کے سفر کے دوران سیکڑوں خطبات دئے ہیں اور حیدرآباد میں منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں صدارت اور مقرر کی حیثیت سے محفل کی رونق میں اضافہ کیا ہے، حیدرآباد کی اکثر ادبی سرگرمیوں کی پروفیسر فاطمہ پروین روح رواں ہیں۔

پروفیسر فاطمہ پروین میں غیر معمولی تنظیمی صلاحیتیں تھیں وہ ایک بہترین منتظم بھی ہیں دوران ملازمت کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر مقابلے کا انعقاد، ورکشاپ اور سمینار کا انعقاد، توسیعی لیکچر کا اہتمام ہر کام میں وہ متحرک رہیں اور بہتر منصوبہ بندی، باہمی ربط کے ذریعے انھوں نے ہر پروگرام کے کامیاب انعقاد میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا، اکثر پروگراموں کی نظامت ان ہی کے ذمہ ہوا کرتی تھی انھوں نے بحیثیت صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے 90 سالہ جشن میں بھی نمایاں رول ادا کیا اور اس موقع پر مجلّہ عثمانیہ کی اشاعت بھی عمل میں لائیں، اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے بحیثیت وائس پرنسپل آرٹس کالج کے بھی کئی ایک پروگراموں کو منظم انداز میں انجام دیا۔ وہ شہر کے مختلف ادبی اداروں وانجمنوں سے بھی وابستہ رہیں جن میں اقبال فاؤنڈیشن، حیدرآباد اکیڈمی اور ادارہ شعر وحکمت۔ ان اداروں کے مختلف پروگراموں کے کامیاب انعقاد میں ان کا اہم کردار رہا ہے، ان باتوں سے ان کی تنظیمی صلاحیتوں کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔

بلبل دکن پروفیسر فاطمہ پروین کی ہمہ جہت صلاحیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر آمنہ تحسین، شعبۂ ویمنس ایجوکیشن، مولانا آزاد نیشنل حیدرآباد نے لکھا ہے:

> '' پروفیسر فاطمہ پروین ایک شاعرہ کی حیثیت نہیں رکھتیں، لیکن نثر میں شاعری کرنے والے چند ایک غیر معمولی افراد کی فہرست میں ضرور شامل ہوسکتی ہیں، وہ ایک فعال اور ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں، ان کے کارنامے علمی، ادبی، سماجی، تہذیبی شعبوں پر محیط ہیں۔ ان کی علمیت اور فعالیت

کی جہات کو اگر دیکھا جائے تو ان کے جو اہم ترین پہلو واضح ہوتے ہیں وہ ہیں، تدریس، تحقیق، تنظیم، اور تقریر۔ ان چاروں شعبوں میں ان کے کارنامے مساویانہ اہمیت رکھنے کے باوجود ان سب میں ان کی خطابت کا پہلو مزید اہمیت کا حامل اور غالب نظر آتا ہے۔"

(ڈاکٹر آمنہ تحسین، پروفیسر فاطمہ بیگم پروین۔صناع کلام، گواہ اردو ویکلی حیدرآباد، 7 تا 13 فروری 2014، ص 15)

ڈاکٹر فاضل حسین پرویز گواہ ویکلی نے ادارہ ایوان فنکار کے ساتھ 2014 پروفیسر فاطمہ کے جلسے اعتراف خدمات کا انعقاد عمل میں لائے تو اس موقع پر انھوں نے احمد علی برقی اعظمی سے پروفیسر فاطمہ بیگم پروین کی خدمات پر منظوم تاثرات لکھنے کی فرمائش کی تھی، جس کو گواہ اردو ویکلی کے پروفیسر فاطمہ پروین نمبر میں بھی شائع کیا۔ ملاحظہ ہو:

فاطمہ بیگم ہیں فخر روزگار
شخصیت ہے ان کی وجہِ افتخار
ان کی علمی کاوشیں ہیں لازوال
دلنشیں ہیں ان کے ادبی شاہکار
شعبۂ اردو سے وابستہ تھیں وہ
جس کو حاصل ہے جہاں میں اعتبار
اپنی معیاری کتابوں کے لیے
ہیں کئی اعزاز سے وہ ہمکنار
ان کو ہے تدریس سے فطری لگاؤ
ان کے اردو ترجمے ہیں شاندار
کام سے اپنے بڑھایا عمر بھر
اپنی تہذیب و ثقافت کا وقار
اختر انصاری پہ ان کی نقد سے
ان کا معیار شرف ہے آشکار
ان کے گلہائے مضامیں آج بھی
گلشنِ اردو میں ہیں مثلِ بہار
وہ رہیں گی زیب تاریخ ادب
ہیں جو اقلیم ِادب کی تاجدار
معترف ہے ان کی عظمت گواہ
نامور لوگوں میں ہے جن کا شمار

تصانیف کا جائزہ:

پروفیسر مغنی تبسم نے پروفیسر فاطمہ پروین کی پہلی کتاب "اختر انصاری کی شاعری کا تنقید مطالعہ" کا مقدمہ لکھا ہے جس میں پروفیسر فاطمہ کی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ فاطمہ پروین ادب کا ستھرا ذوق رکھتی ہیں، ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ تنقید میں انھوں نے کسی ایک دبستان کی پیروی کرنے کے بجائے سبھی دبستانوں سے بقدر ضرورت استفادہ کیا ہے، دوسرے نقادوں کی آرا سے متاثر ہونے کے بجائے اپنے ذوق ادب اور مطالعہ پر بھروسہ کیا ہے، تنقید نگاری میں انھوں نے جس خوداعتمادی کا اظہار کیا ہے اس سے توقع بندھتی ہے کہ وہ آئندہ چل کر ایک اچھی نقاد ثابت ہوں گی۔"

(پروفیسر مغنی تبسم "اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ" مقدمہ، ص 10،9)

پروفیسر فاطمہ پروین کی صلاحیتوں کے پیش نظر ان کے استاد محترم نے 1980 میں جو پیشین گوئی کی وہ آج درست ثابت ہوئی آج ان کا شمار اردو کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے، انھوں نے سخت محنت، ریاضت اور سنجیدہ جدوجہد سے ادب میں ایک مقام بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

پروفیسر فاطمہ پروین نے اپنی پہلی تصنیف "اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ" میں جدید شعراء میں اختر انصار کی اہمیت اور ان کے کارناموں کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جدید شعرائے اردو میں اختر انصاری کی اہمیت اور انفرادیت مسلمہ ہے وہ جس پایہ کے شاعر ہیں اس درجہ کے افسانہ نگار اور نقاد بھی ہیں، انگریزی اور دوسری زبانوں کے ادبیات میں ایسی مثالیں بکثرت ملیں گی لیکن اردو میں ایسی ہمہ گیر شخصیتیں خال خال ہی نظر آتی ہیں، اختر انصاری کا سب سے اہم اور ہمیشہ زندہ رہنے والا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قطعہ جیسی روایتی صنف کو نیا قالب اور نئی روح عطا کی۔ ان کے دیگر تخلیقی اور تنقیدی کارناموں سے صرف نظر بھی کیا جائے تو وہ صرف اپنے قطعات کی وجہ سے اردو شعراء میں ایک نمایاں مقام پانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔"

(پروفیسر فاطمہ پروین "اختر انصاری کی شاعری کا تنقید و مطالعہ" حرف آغاز، ص 5)

پروفیسر فاطمہ پروین نے مطالعہ کے مفہوم، اقسام پر اپنی کتاب کلاسیکی شاعری کا مطالعہ میں اور اس سے متعلق لکھا ہے:

"مطالعہ۔۔ایک ایسا لفظ جس میں معنی تہہ در تہہ چھپے ہیں، سر

سری نظر بھی مطالعہ، گہری نظر بھی مطالعہ، حاصلِ مطالعہ، صاحبِ مطالعہ کے ذوق پر منحصر۔ غرض اس اتھاہ سمندر میں، میں اپنی استعداد کے موافق شامل ہوئی ہوں۔ غزل، مرثیہ، قصیدہ اردو شاعری کی کلاسیکل اصناف اپنے چند اٹوٹ حصوں کے ساتھ میرے اور آپ کے مطالعہ کی کڑی بن کر کتابی شکل میں سامنے ہیں۔''

(پروفیسر فاطمہ پروین، کلاسیکی شاعری کا مطالعہ، ص9)

پروفیسر فاطمہ پروین نے ڈاکٹر گوپی کی ''نانی لو'' کا ترجمہ اردو میں ننھی نظمیں کے عنوان سے کیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی نے تلگو شاعری میں صنفِ سخن ''نانی لو'' کو ایجاد کیا۔ ان کے اس کارنامے سے متاثر ہو کر پروفیسر فاطمہ نے نانی لو کا ترجمہ ''ننھی نظمیں'' کے عنوان سے کیا ہے۔

پروفیسر فاطمہ پروین کی ترجمہ نگاری 'ننھی ننھی نظموں کے حوالے سے' کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر مظفر شہ میری وائس چانسلر عبدالحق اردو یونیورسٹی نے لکھا ہے:

''مجھے یہ کہنے دیجئے کہ پروفیسر فاطمہ کے ان ترجموں کو پڑھ کر اردو کا کوئی بھی قاری اس طرح لطف اندوز ہوسکتا ہے جیسے تلگو کا قاری ان کی اصل کو پڑھ کر۔ یہ ترجمہ محض نرے ترجمے نہیں ہیں بلکہ ان میں اصل نظموں کی روح سمیٹ کر آگئی ہے۔ جس کے لیے پروفیسر فاطمہ قابلِ مبارک باد ہیں۔ ان نظموں کے بالمقابل میں تلگو میں جو نظمیں تحریر ہیں وہ بالکل مختلف ہیں، اس لیے گماں ہوتا ہے کہ ان کے بدلے نئی نظموں کو لکھ دیا گیا ہے، پروفیسر فاطمہ نے تلگو کی ایک مقبول اور نئی صنف سخن کا ترجمہ پیش کر کے اردو قارئین کے علم میں اضافہ کرنے کے علاوہ ان کی جمالیاتی تسکین کا اہتمام بھی کیا ہے۔''

(پروفیسر مظفر شہ میری، پروفیسر فاطمہ پروین کی ترجمہ نگاری، گواہ اردو ویکلی حیدرآباد، 7 تا 13 فروری 2014، ص14)

پروفیسر فاطمہ پروین نے ''پروفیسر مغنی تبسم ایک روشن چراغ تھا نہ رہا'' کے عنوان سے پروفیسر مغنی شخصیت اور خدمات پر یہ کتاب ترتیب دی ہے اس کتاب کے آغاز میں کتاب کی اشاعت کے مقصد اور پروفیسر مغنی کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''شاعر، محقق، نقاد، استاد، مدیر، اردو دنیا کی مشہور و مقبول شخصیت عالیجناب پروفیسر مغنی تبسم مرحوم کے بارے میں اس کتاب کا مقصد علم وادب کی منور کرنوں کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھنا ہے تا کہ اس کی روشنی میں وہ اپنے مستقبل کی صورت گری کر سکیں۔ پروفیسر مغنی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ شعر وادب کی خدمت میں ہمیشہ مصروف رہے، ان کی تحریروں کا جائزہ آسان کام نہیں، مختلف اور متعدد شعبۂ جات میں موصوف کی دلچسپیاں ان کی ست رنگی شخصیت کا حصہ رہیں، اس کتاب کے توسط سے ان کی شخصیت کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تا کہ آنے والے طالب علم اس نابغۂ روزگار شخصیت سے واقفیت حاصل کر کے اپنی صلاحیت کے مطابق ان سے استفادہ کر سکیں۔''

(پروفیسر فاطمہ پروین، پروفیسر مغنی تبسم ایک روشن چراغ تھا نہ رہا، ص7)

امید کی جاتی ہے کہ بلبل ہند سروجنی نائیڈو کے شہر حیدرآباد دکن سے تعلق رکھنے والی بلبل دکن پروفیسر فاطمہ پروین ہمہ جہت کارناموں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

❑❑❑

Dr. M A Azeez Sohaill

Tgt Urdu

TMRS Yakuthpura Boys 1

Awaise function Hall

Mughal pura, Hyderabad 500002 (Telangana)

Mob: 9110759869

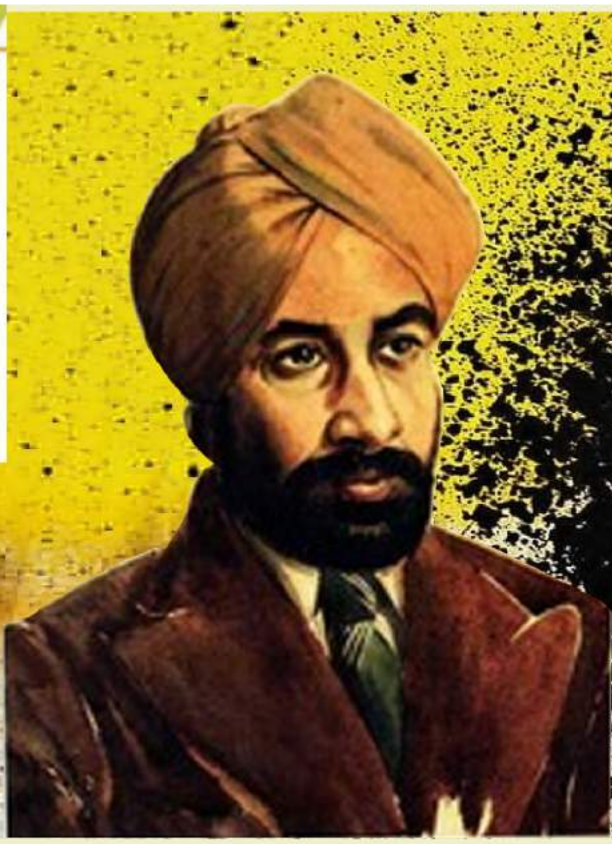

ڈاکٹر رشید جہاں انور

راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقات میں پنجابیت کی جھلک

اردو ادب کے مراکز ہمیشہ سے ہی لکھنؤ اور دہلی گردانے جاتے رہے ہیں مگر اس زبانِ شیریں کی ترقی میں جتنا اہم رول خطۂ پنجاب نے ادا کیا ہے اس سے کسی کو بھی منکر ہونے کی گنجائش نہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اسی سرزمین میں ''آبِ حیات'' لکھا اور مولانا الطاف حسین حالی نے ''مسدسِ حالی'' جیسی عظیم ترین نظم کی تخلیق کی۔

1930 اور 1940 کے دوران میں افسانہ نگاروں کے ایک نوجوان گروہ نے ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ افسانے کو نئے اسلوب، نئے زاویے، نئے معنی اور نیا اندازِ فکر دے کر جلد ہی افسانوی ادب کے سربراہوں کا سا مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان میں اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس اور احمد ندیم قاسمی پیش پیش تھے۔

راجندر سنگھ بیدی کا فن شدید انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کا اسلوب بالکل جدا ہے۔ بیدی کے اسلوب کا جائزہ لینے سے پہلے ادب میں اسلوب کی کیا معنویت ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تو بہتر ہوگا۔ آل احمد سرور جو راجندر سنگھ بیدی کے مداحوں میں سے تھے، اسلوب کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''اگر واضح خیال، موزوں اظہار کافی ہے تو اس میں ندرت، انفرادیت یا بانکپن کا کیا سوال ہے۔ یہیں شخصیت اور اسلوب کی بحث آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسٹائل میں شخص ہے (Style is the man)۔ حالانکہ شخصیت، اسلوب میں سیدھے سادے طریقے سے جلوہ گر نہیں ہوتی۔ وہ الفاظ کی چھلنی میں چھن کر آتی ہے۔ اور یہ الفاظ ہی ایک خاص سانچہ رکھتے ہیں۔ جو الفاظ ایک شخص استعمال کرتا ہے وہ ایک دور یا مزاج یا روایت کے آئینہ دار ہوتے ہیں یعنی وہ انفرادی کے ساتھ اجتماعی خصوصیات رکھتے ہیں۔

(نظر اور نظریے: آل احمد سرور)

ایک رائے کے مطابق کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی سے اردو کے عظیم افسانہ نگاروں کا ایک مثلث بنتا ہے۔ ایک ایسا مثلث جس کے تینوں زاویے برابر ہیں۔ یہ تینوں افسانہ نگار اتفاق سے پنجاب سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

پروفیسر محمد حسن نے اردو کے افسانوی ادب میں موجود اسلوب کی اقسام پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''پہلا اسلوب منٹو کا ہے۔ منٹو کی زبان اپنی روز کی گفتگو سے گہرا رشتہ رکھنے والی شیریں زبان ہے جس میں پنجابی لہجے کے ساتھ بمبیا اردو کی آمیزش ہے۔ دوسرا اسلوب کرشن چندر کی رومانوی نثر کی تابناکی ہے جہاں روشنی اور دھوپ ہے۔ زندگی کی ناہمواری پر سخت طنز ہے اور یہ طنز واقعات کی زبان میں پیش ہوتا ہے۔ اچانک موڑ کاٹنے کا کرشن چندر کو، کوئی شوق نہیں ہے بلکہ یہاں زندگی اپنے پورے توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ ابھرتی ہے۔ اسلوب کی رومانوی خوابناکی

کے ساتھ ساتھ یہاں قصے کی فضا اور واقعات اور اس کے زیرِ زمین تاثرات کا بہاؤ فیصلہ کن ہے۔ جبکہ راجندر سنگھ بیدی کے اسلوب میں عام انسان کے اندرونی کرۂ ارض کی سیر ہے جس میں غیر فطری اور غیر معمولی کرداروں کی تحلیل نفسی کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ عام انسانوں کی باطنی زندگی کی چھوٹی موٹی مسرتوں اور حسرتوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ گویا چیخوف اور گوگول کی کہانیوں سے قریب ہیں اور اس خصوصیت میں ان کا کوئی ہمسفر ہے تو صرف غلام عباس، جن کی کہانیاں 'آنندی' اور 'دھنک' یا 'اوور کوٹ' اس کی مثالیں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ غلام عباس تخیل کے ذریعہ بہت دور تک پرواز کرتے ہیں جبکہ بیدی باطنی زندگی کی لطافتوں اور نزاکتوں سے قریب رہتے ہیں۔ 'اپنے دکھ مجھے دے دو' اور 'لاجونتی' اس کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں۔

(افسانوی ادب کی تدریس، ادبیات شناسی: پروفیسر محمد حسن)

بیدی کے فن کی ایک اور خوبی بہت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ اپنے کام کو بہت ایمانداری سے لیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے کسی ذاتی مسئلے کو بیچ میں لاتے ہیں۔

بیدی نے اپنے افسانوں میں ویسے ماحول کا ذکر کیا ہے جن سے وہ گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان میں پنجاب کے دیہات کی خوشبو بھی ملتی ہے اور مہابھارت و گیتا کی روشنی بھی۔ لہٰذا اس تناظر میں بیدی کے خیال جس طرح نمودار ہوئے وہ عام روش سے مختلف نظر آئے۔ پنجاب سے ان کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مجبوریٔ حالات کی وجہ سے وہ ملک کے کئی حصوں میں رہے۔ وہاں کی زندگی کے زیر اثر بھی انھوں نے کئی کہانیوں کی تخلیق کی لیکن مجموعی طور پر ان کی تخلیقات کے ماحول پنجاب کے رنگوں میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پنجابیت کا یہ رنگ بے ساختہ طور پر پیدا ہوتا ہے اور پڑھنے والا اس رنگ میں ڈوب کر مسرور ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بیدی کی زبان پر لگاتار اعتراضات ہوتے رہے لیکن بیدی پر اس بے جا نکتہ چینی کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ آخرکار بڑے بڑے ناقدوں نے جب قدرے غور سے دیکھا تو بیدی کی یہ خاص خوبی نظر آنے لگی۔

آل احمد سرور ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ''گرہن'' کا پہلا جملہ سن کر ایک اہلِ زبان نے کہا تھا کہ یہ کون سی زبان ہے، کیا یہ اردو ہے؟ اور مجھے کہنا پڑا تھا: ہاں یہ اردو ہے لیکن یہ ایک پنجابی نے لکھی ہے۔

اور وہ جملہ تھا: ''روپو، سیتو، کھتو اور منّا۔ ہولی نے اساڑھی کے کائستھوں کو چار بچے دئے تھے اور پانچواں چند ہی مہینوں بعد جننے والی تھی۔''

اس طرح سے ایک اور جملہ جو بیدی کی شاہکار کہانی ''لاجونتی' کا ہے۔ ''ہتھ لائیاں کملان نی لاجونتی کے بوٹے۔''

اس مشہور پنجابی بول سے اس کہانی کی شروعات ہوئی ہے۔ یہ کس قدر فطری نظر آتا ہے لیکن اگر اسی بول کا اردو میں ترجمہ کریں تو کچھ اس طرح سے ہوگا: یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ذرا ہاتھ بھی لگاؤ تو کمہلا جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات صاف نظر آ رہی ہے کہ ترجمے میں وہ مفہوم نہیں آیا۔ ''ہتھ لگائیاں'' کا ترجمہ ہو ہی نہیں پاتا کیونکہ زبان کی لطافتیں بھی لاجونتی کے پودوں کی طرح ہی ہوتی ہیں۔

بیدی اپنی کہانیوں میں ایسی زبان کا استعمال کرتے ہیں جو ان کے کرداروں کے جذبات و احساسات کی صحیح معنوں میں ترجمان ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو ایسی زبان ہوتی ہے جو اردو زبان تو ہوتی ہے لیکن اپنے کرداروں کے ماحول سے ہم آہنگ۔ بیدی اسی طرح کی زبان لکھتے رہے اور اعتراض کرنے والے آخرکار خاموش ہو گئے۔ منٹو کا ایک مشہور جملہ ہے: جب کوئی پنجابی اردو بول رہا ہوتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جھوٹ بول رہا ہو۔

یہ اس فنکار کا جملہ ہے جس کی نثر اردو زبان کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ منٹو کے اس جملے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ کسی بھی زندہ زبان کو مختلف خطوں کے لوگ مختلف ڈھنگ سے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے بنیادی طور پر تو کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ اس سے زبان میں ایک وسعت پیدا ہوتی ہے۔ بیدی خود اپنے معترضوں کو خاموش کرنے کے لیے ڈاکٹر اقبال کی مثال دیا کرتے تھے کہ اس صدی کا سب سے بڑا شاعر اقبال گفتگو میں ایسی اردو کا استعمال کرتا تھا جس کا لہجہ خالص پنجابی ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک بار ایک لکھنوی مولانا نے علامہ سے لاہور میں ملاقات کی۔ مولانا کے دوست نے پوچھا کہ علامہ سے گفتگو ہوئی؟ تو ان کا جواب یہ تھا: ''ہاں بھئی ہوئی.... میں جی ہاں، جی ہاں کرتا رہا اور وہ ہاں جی، ہاں جی کرتے رہے۔''

بیدی کی بیشتر کہانیوں کے پس منظر میں پنجابیت کی جھلک بار بار ملتی ہے۔ بیدی نے ملک کی تقسیم کے وقت پنجاب کی پانچ ندیوں میں پانی کی جگہ خون کو بہتے دیکھا ہے۔ ان کے کئی عزیزوں کی بھی جانیں گئیں۔ اس بربریت اور خونی کھیل کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ایک کہانی لکھی ''لاجونتی''۔ اس موضوع پر بیدی کے کئی ہم عصروں نے بھی خوبصورت کہانیاں لکھیں، جن میں منٹو کی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ایک لافانی تخلیق ثابت

ہوئی۔لیکن ان دردناک حادثات کا سب سے اہم اور جذباتی موضوع جسے بیدی نے چُنا، وہ تھا اغوا شدہ عورتوں کا مسئلہ۔ بیدی نے بتایا کہ جب کوئی عورت اغوا کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ مرد کی مردانگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ مرد وہی کیوں نہ ہوں جن پر ان عورتوں کی حفاظت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس مسئلے کا حل کسی کے پاس نہیں تھا۔ یہ مسئلہ مغربی پنجاب کا بھی تھا اور مشرقی پنجاب کا بھی۔ ایسی بدنصیب عورتوں کو پھر سے قبول کرنے کا حوصلہ کہاں سے آئے۔ یہ وہ عورتیں تھیں جو بے بس اور لاچار تھیں۔ ان کو وہی دکھ ملا تھا جو سیتا کو راون کے پاس قید ہونے کے بعد ملا تھا۔ لیکن جب سیتا کو اگنی پریکشا سے گزرنا پڑا تو ان عورتوں کو کیوں نہ گزرنا پڑتا۔ ''لاجونتی'' ایسی ہی ایک اگنی پریکشا کی کہانی ہے۔ ان عورتوں کی حالتِ زار کو اس طرح بیدی نے ظاہر کیا ہے۔

''مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں باپ، بہن اور بھائیوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں۔ انھوں نے زہر کیوں نہ کھالیا۔ کنویں میں چھلانگ کیوں نہ لگادی۔ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی لیکن انہیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔ کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انہیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی، سہاگ وتی، سہاگ وتی۔ اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی، تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری؟ میں نے تجھے گودی کھلایا، تھا رے! اور بہاری چلاّ دینا چاہتا تھا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کر نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا۔''

بیدی نے یہ کہانی اپنے کرداروں کے جذبات واحساسات سے پوری ہم آہنگی کے ساتھ لکھی تھی تو مشہور افسانہ نگار و صحافی کلام حیدری نے بیدی کی وفات پر ایک تعزیتی نشست میں یہ سوال کیا تھا: بیدی تم لاجونتی ہو یا لاجونتی کے شوہر؟

اور ان کے اس سوال کا جواب پنجاب کے عظیم صوفی شاعر بھلّے شاہ کے اس جملے میں ملتا ہے۔ ''رانجھا، رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوی۔''

ان کی کہانیوں میں پنجابی ماحول، رہن سہن، عادات واطوار، عقاید ونظریات کی حقیقی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے کیونکہ ان کی کہانیوں کے بیشتر کردار اسی خطۂ زمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے فن کا نقطۂ عروج بھی پنجابی خوشبو میں رچا بسا ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' میں ملتا ہے۔ اس میں پنجابی تہذیب، وہاں کا معاشرہ، ان کے لوگ، ان کے سوچنے کا ڈھنگ، رسم ورواج بے حد نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اردو ادب کو بیدی کی طرف سے یہ ایک انمول تحفہ ہے۔ اس ناولٹ کے بارے میں کرشن چندر نے ایک بار بیدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''کم بخت، تم خود نہیں جانتے کہ تم کیا لکھ گیے ہو۔''

''ایک چادر میلی سی'' میں شروع سے آخر تک پنجابیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس میں انھوں نے رانو کی مجبوری اور بے چارگی کا ذکر اس انداز میں کیا ہے کہ پوری کہانی حقیقت کے بہت نزدیک نظر آتی ہے۔ جیسے کہ

''رانی چلا رہی تھی۔ رانی بندیے! تیرا پچھا نہ آگا ہائے رنڈیے! تیری شکل اب باجار بیٹھنے والی بھی نہیں، اب تو پیشہ کرنے یوگ بھی نہیں رہی۔''

کچھ اہل زبان کو اس زبان پر اعتراض ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ ایک پنجابی عورت کے ٹوٹے دل کی صدا ہے اور یہ بیدی کا کمال ہے کہ انھوں نے رانو کے جذبات کو، اس کے درد کی شدت کو پنجابی خوشبو کے ساتھ اور پوری صداقتوں کے ساتھ ہم تک پہنچایا ہے۔

پنجابی ہندی الفاظ جہاں جہاں استعمال ہوئے ہیں وہاں وہاں اس کا فنی نقطۂ نظر پورے عروج کے ساتھ نظر آتا ہے۔ پنجاب سے ان کی بے پناہ انسیت اور وابستگی ان کے خون میں تھی۔ پھر بھی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی تخلیقات کسی محدودیت کی شکار ہیں۔ ان کی مقبولیت کسی ایک علاقے تک محدود نہیں۔ ان کی تحریروں میں بے پناہ سچائی ہے اسی لیے وہ سب کے محبوب ادیب ہیں۔

□□□

Dr. Rasheed Jahan Anwar
H.No.40-B, Road No.1
Azadnagar
P.O.: Maango
Jamshedpur-831012 (Bihar)
Contact No.: 8507967120,
E-mail: rjanwar2811@gmail.com

ڈاکٹر محمد شفقت کمال

قرۃ العین حیدر
کا فن اور جلاوطنی

بیسویں صدی میں اردو فکشن کے جن علم برداروں نے اسے نئے خدوخال اور نئی وسعتوں سے ہمکنار کرایا اور زندگی کے مختلف اقدار کو سمجھنے اور اسے نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کا ہنر سکھایا ان میں قرۃ العین حیدر کا نام سب سے اہم ہے۔ ان کی پیدائش سرزمین علی گڑھ میں ہوئی۔ اسے علی گڑھ کی مٹی کا اثر کہئے یا پھر لکھنؤ کی تہذیبی روایات کا ثمرہ کہ جس نے قرۃ العین کے فلسفیانہ خیالات کو نہ صرف جلا بخشی بلکہ وہ نظیر بھی قائم کی جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنی شعور کی آنکھیں ایک ادبی گھرانے میں کھولیں۔ ان کے والد اردو کے مشہور فکشن نگار سجاد حیدر یلدرم تھے اور والدہ نذر سجاد حیدر تھیں جن کا شمار اردو کے خواتین فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس طرح ادب کا ذوق انھیں وراثت میں ملا۔ گھر کے علمی وادبی ماحول نے ان کے تخلیقی ذہن کی مزید آبیاری کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ محض ۱۱ سال کی عمر میں جب شعور وآگہی پورے طور پر پختہ بھی نہیں ہو پاتے، جب آنکھوں کی چلمن میں قوس وقزح کی طرح ہزاروں سپنے رقص کرتے رہتے ہیں، ایسے وقت میں انھوں نے اپنا پہلا افسانہ تخلیق کیا جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ان کا یہ تخلیقی سفر 80 سال کی عمر تک جاری رہا۔ اس دوران انھوں نے کئی بہترین ناول، ناولٹ اور افسانے تخلیق کیے اور ورجنا وولف کے اس سوال کا جواب بھی دے دیا جو انھوں نے کیمبرج یونیورسیٹی کے یخ بستہ لیکچر روم میں اٹھایا تھا کہ کیا ایک خاتون اعلیٰ ادب کی تخلیق کر سکتی ہے۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ قرۃ العین حیدر نے نہ صرف اعلی ادب کی تخلیق کی بلکہ ان کی شخصیت اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے یہاں انسانی وجود کے داخلی اضطراب کے ساتھ ساتھ ذہنی آشوب اور احساس تنہائی کی صدائے بازگشت ہے جو ان کی تخلیقات کو ایک نئی معنویت عطا کرتے ہیں۔

اردو افسانے میں قرۃ العین حیدر نے باضابطہ طور پر اپنی شناخت اس زمانے میں قائم کی جب ہندوستان کے منظر نامے پر زبردست تبدیلی ہو رہی تھی۔ پورا سماجی نظام درہم برہم تھا۔ ایک طرف جاگیرانہ نظام کا انہدام ہو رہا تھا تو دوسری طرف اس کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی تہذیب وتمدن لے رہی تھی۔ مشرق سے طلوع ہونے والا آفتاب اب مغرب میں غروب ہونے کو تھا۔ ایسے میں تقسیم ہند کے سانحہ نے انسانی زندگی کی تمام تر بنیادوں کو منتشر کر دیا۔ اب انسان کا وجود ریزہ ریزہ ہو چکا تھا اور یہ زندگی کے لیے نہایت ہی پریشان کن مرحلہ تھا۔ قرۃ العین حیدر نے تقسیم سے کچھ قبل ہی لکھنا شروع کیا اور جلد ہی افسانوی منظر نامے پر اپنا اعتبار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ ان کے مخصوص اور منفرد اسلوب نے اردو فکشن میں ایک نئی روایت کو جنم دیا اور اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔ قرۃ العین حیدر کا اختصاص یہ ہے کہ وہ اپنے منفرد اسلوب کے علاوہ

نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر بھی گہری نظر رکھتی ہیں۔ان کے افسانوں میں معاصر انسانی رویوں کی شکست و ریخت ہے، جس کو وہ ماضی کی بازیافت اور وقت کے تسلسل کے طور پر برتتی ہیں۔قرۃ العین حیدر خالص کلاسیکی ضابطے کی افسانہ نگار ہیں۔لیکن ان کے یہاں ماضی کی بازیافت ہے، وہ فنطاسی (fantacy) محض تکنیک کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ کہانی بیان نہیں کرتیں بلکہ آئیڈیاز فارم کرتی ہیں۔تاہم ان کی زبان بیانیہ کی ٹھوس زبان ہے۔ان کی کہانی کے متن میں ایک اور کہانی پوشیدہ ہوتی ہے جس کو ہم برصغیر کے دم توڑتی مشترکہ تہذیب وثقافت اور جاگیردارانہ نظام کے بکھرنے کا نوحہ کہہ سکتے ہیں۔

جہاں تک قرۃ العین حیدر کے فکشن کا تعلق ہے ان کے ناول جس بسیط ماضی اور تاریخی وتہذیبی دور کی بازیافت کرتے ہیں۔ان کے افسانے اس کے متحمل نہیں ہو سکے، اور نہ ہی ان کے اس وژن کو ہی ان افسانوں میں کوئی راہ ملی جو ان کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔یہاں تک کہ افسانہ ''جلا وطن''، اور ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' جیسے طویل افسانوں میں بھی وہ تقسیم کی تہذیبی اور تاریخی واردات کو اس طرح پیش نہیں کر سکیں، جس کو وہ ناول کے پیرایہ میں پیش کرتی ہیں۔وہ بیک وقت ماضی اور حال دونوں میں سانس لیتی ہیں۔ان کے بیشتر افسانے اچھے خاصے طویل ہوتے ہیں کیوں کہ وہ جس سماجی نظام اور تاریخی وتہذیبی ماحول کو پیش نظر رکھتی ہیں اس کے لیے افسانہ متحمل نہیں ہوسکتا۔یہاں تک کہ وہ جس معاشرے کی تاریخ وتہذیب اور ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں وہ دراصل اودھ کی جاگیردارانہ اقدار کے زوال کی کہانی ہے۔اس کہانی میں مشترکہ تہذیب کا بیان بھی ہے اور اس کے انہدام کا رونا بھی۔کیونکہ برصغیر میں دم توڑتی ہوئی مشترکہ تہذیب قرۃ العین حیدر کو بارہا پریشان کرتی تھی جس کا اظہار انھوں نے اپنی تخلیقات میں جا بجا کیا ہے۔پیش نظر افسانہ ''جلاوطن''، تقسیم ہند کے اسی کرب کی داستان ہے۔یہ داستان محض ذہنی انتشار کی داستان نہیں ہے بلکہ مشترکہ تہذیب کے انہدام کی بھی داستان ہے۔اس میں رشتوں کے مابین پیدا شدہ خلیج، تہذیبی اقدار کے زوال کے ساتھ ساتھ اجنبیت وجلاوطنی کے کرب کا بھی بیان ہے۔اس سلسلے میں شفیع جاوید کا قول کافی غور طلب ہے۔

'''جلاوطن' اور 'ہاؤسنگ سوسائٹی' قرۃ العین حیدر کے یہ دونوں قدرے طویل افسانے ہیں اور ان کے تخلیقی سفر کے دو اہم سنگ میل ہیں۔ جہاں تصادم ہے، تاریخ اور تاریخیت (Hiastoricity) ہے، نئے دور کی پیچیدہ دنیا ہے، عالم تمام الجھا ہوا ہے۔جلاوطنی اور ہجرتوں کے عبرتناک بیان ہیں۔انسانی رشتوں کے انہدام کا تاسف ہے اور وہ صدی جو ابھی کچھ ہی دنوں قبل گزری ہے، اس میں زوال آدم اور گمشدہ جنتوں کے کرب جھیلتے ہوئے لوگ ہیں۔''

(قرۃ العین حیدر: شخصیت اور فکر وفن، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، اگست 2008،ص 171)

جلاوطن افسانہ میں تقسیم ہند کی ہولناکیوں کا ذکر ہی نہیں ملتا بلکہ تقسیم سے قبل وتقسیم کے بعد کا منظرنامہ بھی ملتا ہے۔یہاں تقسیم ہند سے قبل کا ہندوستان اپنی مشترکہ تہذیب وتمدن کی گواہی دے رہا ہے۔ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اخوت و بھائی چارگی، اخلاق ومحبت یہاں کی تہذیبی روایت کا حصہ رہی ہے۔قدیم ہندوستان میں سامراجیت کے تصور نے اگرچہ اپنے پنکھ پسارے رکھے تھے لیکن اس معاشرے کی خوبصورتی یہ تھی کہ لوگ مذہبی تفریق کی بنا پر ایک دوسرے سے خائف نہیں تھے۔ہندوؤں کے مذہبی تہواروں مثلاً ہولی، دیوالی، درگا پوجا اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں مثلاً عید، بقرعید اور محرم وغیرہ میں دونوں اقوام کے لوگ شریک ہوتے اور قومی یکجہتی کا بھرپور ثبوت دیتے۔حکومت چاہے ہندوؤں کی رہی ہو یا مسلمانوں کی آپسی بھائی چارگی کا جو تصور ہندوستانی معاشرے میں قائم تھا اس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ اس عہد میں ہندو و مسلم کا رہن سہن، کھان پان سب کچھ ایک جیسا تھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔اس سلسلے میں ذرا یہ مکالمہ دیکھیے:

''ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہ تھا۔خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے پائجامے پہنتیں۔اودھ کے بہت سے پرانے خاندانوں میں بیگمات اب تک لہنگے بھی پہنتیں۔بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائنچوں کا پائجامہ پہنتیں۔۔۔۔۔۔ زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لیے منہ نیلا پیلا کیے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے ـــ برسو رام دھڑاکے سے بڑھیا مرگئی فاقے سے۔گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا ـــ ہاتھی گھوڑا پالکی ـــ جے کنہیاں لال کی۔مسلمان پردے دار عورتیں جنہوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں ـــ بھری گگری موری ڈھرکائی شام ـــ کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا

۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزاپور اور جون پور سے لے کر لکھنؤ اور دلّی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصویر تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقا نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔"

(قرۃ العین حیدر، پت جھڑ کی آواز (افسانوی مجموعہ)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1965ء، ص58-59)

یہ تمام جزئیات دراصل اس تمدن کی مظہر تھیں جنہیں پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیبی ہمہ گیری اور وسعت نظر اور ایک رچے ہوئے جمالیاتی حس نے بڑے چاؤ سے جنم دیا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دل آویز تصاویر ہمارے مشترکہ تہذیب کی میراث تھی جسے قرۃ العین حیدر کے یہاں بخوبی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اب جب کہ موجودہ تناظر میں اس کی نوعیت یکسر بدل چکی ہے، لیکن روایت کا اپنا جدلیاتی عمل تو ہوتا ہی ہے اور زبان و بیان کی جمالیات کے اپنے کچھ بنیادی خصائص بھی ہوتے ہیں جو کہ زماں و مکاں کے پابند ہونے کے باوجود ہر مقام اور ہر زمان میں اپنی لازوال قوتوں کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ زماں و مکاں کی پابند ہو کر رہ جاتی ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس وہ زماں و مکاں یکسر توڑ پھوڑ دیتی ہیں۔ کیونکہ وہ جس سماج اور جس عہد سے برسرپیکار ہیں اس میں روایت کی جڑیں بہت گہری اور وسیع ہیں تاہم فن کی اساسی اقدار یا یہ کہہ لیجیے فکشن کے اساسی اقدار پر وہ کسی مغالطے کا شکار قطعی نہیں ہوتیں۔ ان کے افسانوی بنت میں ڈرامائی کیفیت اور مصور کی جزئیات کام کرتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر حقیقت کو رد تو نہیں کرتیں لیکن حقیقت کا نیا انکشاف ضرور کرتی ہیں چونکہ انھوں نے اپنے افسانوں میں ان تمام حالات کو پیش نظر رکھا جہاں زندگی کی اعلیٰ قدریں اپنی معنویت کھو رہی تھیں یا کھو چکی تھیں۔ افسانہ ''جلاوطن'' کو اگر سماجی اور ثقافتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ تقسیم سے قبل اور بعد کی صورت حال کو ایک ناسٹلجیا کے طور پر پیش کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ''جلاوطن'' میں اپنے تمام مرکزی کرداروں کی جلاوطنی کی داستان سنائی ہے۔ انھوں نے ایسے کردار پیش کیے ہیں جن کا تعلق تین الگ الگ نسل سے یا یوں کہیں تین جنریشن سے ہے۔ یہ کردار گرچہ اپنی نسلوں کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن ہر ایک کی زندگی انتہائی کرب انگیز اور جلاوطنی کے درد کو سمیٹے ہوئے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد کا مقدر ہی جلاوطنی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مصنفہ نے جان بوجھ کر زیادہ تر کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کو اس جلاوطنی کے پس منظر میں دکھانے کی کوشش کی ہو تا کہ قارئین اس ذہنی کرب کو محسوس کر سکیں جسے اس عہد کے ہر خاص و عام نے ہر لمحہ برداشت کیا ہے۔

افسانے کے پہلے مرکزی کردار آفتاب رائے نہایت ملنسار، با اخلاق اور روایتی اقدار کے پاسدار ہیں۔ وہ ایک یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ مشترکہ تہذیب کے پروردہ آفتاب رائے تقسیم سے قبل کے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات سے مایوس ہیں۔ جہاں ایک طرف ہندو مہاسبھائی انھیں مسلمان بننے کا مشورہ دیتے ہیں اور جون پور کا قاضی جیسے فقرہ سے نوازتے ہیں وہیں دوسری طرف مسلمان نوعمر لڑکے لڑکیاں انھیں کٹر مہاسبھائی تصور کرتے ہیں۔ گویا کہ آفتاب رائے جیسا مشترکہ تہذیب کا پروردہ دونوں فرقے کے لوگوں کو قابل قبول نہیں ہوتا۔ اس صورت حال میں آفتاب رائے اپنوں کے درمیان پھیلی اس جلاوطنی کے کرب کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے کھول میں سمٹ کر رہنا پسند کرتے ہیں اور جلاوطنی کی زندگی کو اپناتے ہیں۔ یہاں مصنفہ نے بڑے سفاکانہ انداز میں آفتاب رائے کی نسل کا المیہ پیش کیا ہے۔

اس افسانے کا دوسرا مرکزی کردار کنول کماری ہے جسے آفتاب رائے نے نہ صرف ٹھکرا دیا بلکہ اس پر تحفظ کوشی اور سماجی و معاشی معیار کی جستجو کا الزام بھی عائد کر دیا۔ کنول کماری آفتاب رائے کے اس رویے سے جس ذہنی کرب میں مبتلا ہوئی وہ اس کے لیے نہایت اذیت ناک ثابت ہوئی۔ یہی ذہنی کرب، ازلی و ابدی پچھتاوے کا یہی ویرانہ، اسے جلاوطنی کی کیفیت سے دوچار کرتا ہے اور وہ اس کشمکش میں یہ کہہ اٹھتی ہے کہ:

''آفتاب بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دنیا جو ہوسکتی تھی۔ اس سے دیش نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہوگیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔'' (ایضاً، ص84)

آفتاب رائے کا کنول کے بجائے اپنے خاندان کو ترجیح دینا ان کی ذہنیت پر سوال اٹھاتا ہے۔ یہاں قرۃ العین حیدر نے تانیثیت کے پس منظر میں کنول کماری کے احساسات کا جائزہ لیا ہے۔ جہاں درد ہے، کسک ہے، شکست خوردگی کا احساس ہے۔ آفتاب رائے نے کنول کماری کے عوض زندگی کے جو خواب سجائے تھے وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ شکست خواب کا کرب ناک دور شروع ہوا۔ زمینداری کا خاتمہ ہوگیا۔ اب اس کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی۔ وہ اپنے ہی معاشرے میں اجنبی ہوگئے اور

اپنی تلاش وجستجو میں خود کو Underground کرلیا۔ اس سلسلے میں مسرت جہاں نے بہت خوب لکھا ہے:

"آفتاب رائے اپنی تہذیبی فضا سے سیاسی تبدیلیوں کے ہاتھوں جلاوطن ہوئے انھوں نے خود بن باس لیا، اپنی تکمیل کی خاطر انھوں نے کنول کو چھوڑا تا کہ خود بے گانگی کا شکار نہ ہوں۔ کنول کو سب ملا جو آفتاب رائے کو نہ ملا لیکن اسے خود بیگانگی کا کرب ملا وہ اپنی ذات سے جلاوطن ہوئی۔ آفتاب رائے کی جلاوطنی خود اختیاری ہے اور کنول کی مجبورانہ۔ رام نے اپنی تکمیل کے لیے بن باس لیا، وہ ہیرو بنے خود کو پایا۔ پھر حکومت ہی نہیں بلکہ دلوں کے راج سنگھاسن پر بھی بیٹھے۔ سیتا نے رام کی طرح بن باس لیا خود کو کھویا۔ لاکھوں کے بول سہے اور بن باس ختم ہونے کے بعد اس کا نیا بن باس شروع ہوا جس کی کوئی معیاد نہ تھی، ازلی ابدی جلاوطنی......"

(قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری: ایک تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر مسرت جہاں، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 2014، ص122)

بہر حال آفتاب رائے اور کنول کماری کے کردار کی صورت میں قرۃ العین حیدر نے نہ صرف ایک عورت کے فطری جذبات کو انگیز کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس دور کے بدلتے حالات اور تہذیبوں کے تصادم کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ ایک طرف کنول کماری ہے جو آفتاب رائے کو اپنی اس جلاوطنی کی زندگی کے لیے قصوروار ٹھہراتی ہے تو دوسری طرف آفتاب رائے آخر تک اپنی ذات کو پانے کی جستجو میں منہمک ہے۔ ادھر کنول کماری ہے جو انھیں کھوکر بھی نہیں کھوتی وہیں دوسری طرف آفتاب رائے اپنی ذات کے کھول میں سمٹ کر بھی اس جلاوطنی کے کرب سے محفوظ نہیں رہ پاتے۔

یہاں قرۃ العین حیدر نے جس خوبصورتی اور جس فنی چابکدستی سے اس جلاوطنی کے کرب کو پیش کیا ہے وہ ان کی سماجی واخلاقی اقدار کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہمیں اس امر کو بھی ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ قرۃ العین حیدر کی رومانیت میں کلاسیکی اقدار واخلاق کی بوسونگھ لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تاہم اسلوب کے اظہار سے وہ رومانی کہی جاسکتی ہیں۔ اسی ضمن میں مشہور ومعروف افسانہ نگار انتظار حسین کا قول صادق آتا ہے کہ تقسیم سے پہلے قرۃ العین حیدر نہ اس انداز میں سوچ سکتی تھیں نہ لکھ سکتی تھیں۔ چونکہ قرۃ العین حیدر کلاسیکی ضبط کی افسانہ نگار ہیں اس لیے ان کے یہاں ماضی کی بازیافت ہے جو ایک مخصوص سچویشن میں قاری کے ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے اور اسی مناسبت سے ہمارا ردعمل کبھی کم شدید ہوتا ہے اور ذہن کے کسی ایک کونے میں وارداتوں کا ایک سلسلہ ابھرنے لگتا ہے اور پوری طرح ذہن پر چھا جاتا ہے۔ جہاں سے یہ عمل شروع ہوتا ہے وہیں سے کہانی اپنی جگہ پکڑ لیتی ہے۔

افسانہ نگار جس عہد میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے وہ اس عہد کی سیاست سے بے تعلق ہوسکتا ہے نہ سماجی اقدار سے اور نہ ہی اپنی ذات سے۔ ایسی صورت میں وہ جذبات کے دباؤ کو محسوس کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ جذبے کا یہ دباؤ اس کے نزدیک کتنا معنی رکھتا ہے۔ اگر اس پس منظر میں ہم دیکھیں تو ان کے افسانوں میں کہانی کرداروں کے ساتھ اپنے شیریں اسلوب میں تاریخ کی بازیافت اور تہذیب وثقافت میں رنگ بھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ افسانہ جلاوطن میں کشوری اور کھیم وتی کے کردار بھی غور طلب ہیں۔ گرچہ ان کرداروں کا تعلق نئی نسل سے ہے لیکن یہ بھی جلاوطن کے کرب سے دو چار ہیں۔ کشوری اور کھیم وتی بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ عید، شب برات، ہولی و دیوالی کی خوشیوں میں جھوم جایا کرتی تھیں۔ لیکن اس گنگا جمنی تہذیب پر سیاست کے کالے بادل منڈرانے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کے درمیان مذہبی فرقہ پرستی کی دیواریں حائل ہونے لگتی ہیں۔ یونیورسٹی کی سیاسی فضا میں دونوں اس قدر کھو جاتی ہیں کہ انھیں ایک دوسرے کے خاندانی روایات واقدار اور جذبات کا خیال بھی نہیں رہتا۔ کھیم وتی ہندومہاسبھا کی حمایتی بن جاتی ہے جبکہ کشوری مسلم لیگ کی ایک سرگرم رکن بن کر ہمارے سامنے آتی ہے اور دونوں لحہ لحہ بنتے بگڑتے سیاسی مذہبی اور تہذیبی کشیدگی میں پوری طرح ملوث ہوجاتی ہیں جیسے جیسے سیاسی حالات تبدیل ہوتے ہیں ان دونوں کے مابین بھی دیواریں حائل ہونے لگتی ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب دونوں ایک دوسرے کی شکل تک دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس کشوری کے بابا سید جعفر عباس ایک قوم پرست اور روایتی اقدار کے حامل انسان تھے۔

قرۃ العین حیدر کے نزدیک ماضی کی بازیافت کا عمل ہی وہ واحد شناخت ہے جو انھیں انفرادیت عطا کرتی ہے۔ یہ المیہ کم نہیں کہ انھوں نے انسان کی ان بنیادی قدروں سے اسے ناپنے یا دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ رومان پرور رویہ ان کی جذباتیت کی گواہی دیتا ہے۔ قرۃ العین حیدر ہر صورت حال ہر واقعے اور تبدیلی کی گواہ ہی نہیں بنتیں بلکہ اس میں اپنی شراکت داری اور موجودگی کا جواز فراہم کرتی ہیں۔ جس کو ہم ایک حد تک اجتماعی Isolation کا نام دے سکتے ہیں۔ گویا محض داخلیت پر یہ اصرار ان کی ذہنی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ اجتماعی Isolation کا یہ عمل ایک حد تک اذیت ناک مرحلے میں داخل ہوجاتا ہے اور ان کے ذہنی

کرب کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

کشوری اپنی تعلیم مکمل کرنے کے فوراً بعد پاکستان جانا چاہتی ہے جب کہ اس کے والد ہندوستان میں رہنا پسند کرتے ہیں۔لیکن اپنے والد صاحب کو اکیلا چھوڑ کر وہ پاکستان نہیں جانا چاہتی۔معاشی حالات خراب ہونے کی وجہ سے وہ ہندوستان میں ملازمت کی تلاش کرتی ہے مگر اسے ہر جگہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔وہ Economics کی بہترین طالبہ ہونے کے باوجود نوکری پانے سے قاصر رہتی ہے۔

اس طرح کے مکالموں سے قرۃ العین حیدر نے تقسیم کے بعد کے سیاسی اور سماجی رویے کو نہ صرف منعکس کیا ہے بلکہ اس ذہنی کرب اور کشمکش کو بھی پیش کیا ہے جس سے اس عہد کا ہر خاص و عام دوچار تھا۔کشوری کو ہندوستان میں رہنے کے باوجود پاکستانی تصور کرنا دراصل اس جلاوطنی کی داستان ہے جس کی جڑیں بے دخلی، بے زمینی اور تہذیبی اقدار کے مٹنے سے سروکار رکھتی ہیں۔یہ جلاوطنی محض کشوری کی نہیں بلکہ یہ اس عہد کا المیہ ہے جس کو قرۃ العین حیدر نے انتہائی کرب سے بیان کیا ہے۔یہ اقتباس دیکھئے:

''ہم لوگ یونیورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ہے مارکیٹ کے مخصوص تھیٹروں میں اپنے بیلے کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولز میں شامل ہوتے ہیں لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہوگا۔

تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی—؟ میرا گھر اب کہاں ہے؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابل رحم کردار بننے کے مستحق تھے—؟؟'' (ایضاً،ص88-89)

ان تمام غیر یقینی اور بے اطمنانی کے باوجود قرۃ العین حیدر ناامید نہیں ہیں انھیں یقین ہے ایک نہ ایک دن حالات ضرور بدلیں گے اور روح کی یہ جلاوطنی ضرور ختم ہوگی اور مستقبل کے امکانات روشن ہوں گے۔دراصل یہ ایک طرح کی رجائیت ہے اور قرۃ العین حیدر اپنے ناول اور افسانوں میں اسے قائم رکھتی ہیں۔جلاوطن کا اختتام جتنا ڈرامائی ہے اس سے کہیں زیادہ رجائی ہے:

''یہ ہمارا پرانہ عہد نامہ تھا۔ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔اب ان کے پاس کیا باقی رہا ہے— آرگن کے مدھم اور لرزہ خیز سروں کے ساتھ قدم اٹھائے ہوئے وہ سب آہستہ آہستہ اپنے راستے پر واپس آئے۔

کنول رانی— کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔یہاں آجاو۔اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر اس خوبصورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے۔اب کسی پچھتاوے۔کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

'پرانے عہد نامے منسوخ ہوئے'،کشوری نے آہستہ سے دہرایا۔ہم اس طرح سے زندہ نہ رہیں گے۔ہم یوں اپنے آپ کو نہ مرنے دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہوگی— ہمارے سامنے آج کی صبح ہے۔مستقبل ہے ساری دنیا کی نئی تخلیق ہے۔لیکن کنول کماری —تم اب بھی رو رہی ہو—؟'' (ایضاً،ص91)

اس اقتباس سے افسانہ نگار کے رجائی پہلو کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔یہ وہی کنول کماری اور کشوری ہے جو بچپن میں ایک دوسرے کی دوست ہیں لیکن کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں حالات کے جبر کا شکار ہو جاتی ہیں۔تقسیم ملک کے بعد کنول کماری لندن چلی جاتی ہے کشوری بھی حالات سے مجبور ہو کر معاشی مجبوریوں کی وجہ سے لندن چلی جاتی ہے اور وہاں پر جب دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو کنول کنواری کشوری کو پاکستانی ہونے کا طعنہ دیتی ہے یہ قرۃ العین حیدر کی رجائیت ہی ہے کہ وہ اس طعنہ زنی کے باوجود دونوں کرداروں کو پھر سے یکجا کر دیتی ہیں اور دونوں میں بھائی چارگی کا وہ جذبہ پیدا کرتی ہیں جو افسانہ نگار کو بے حد عزیز ہے۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانہ محض تقسیم کا المیہ نہیں بلکہ مذہبی بھائی چارگی کے درمیان بڑھتی خلیج کی داستان بھی ہے۔یہ المیہ ہماری مشترکہ تہذیب کے زوال کی نشاندہی کرتا ہے۔ایک سچے فنکار کی کامیابی کی دلیل یہ ہے کہ اس کی تخلیقات ہر عہد میں بامعنی ہوتی ہیں اور اپنے اندر قارئین کو متاثر کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''جلاوطن'' ان کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔

□□□

Dr. Mohammad Shafquat Kamal
HOD Urdu
T. D. B College
Raniganj- 713347 (W.B)
Mob:9333719601
E-mail: shafquatkamal@gmail.com

ریحانہ پروین

بہار کی خواتین افسانہ نگار

بہار میں اردو افسانہ نگاری کا پہلا دور 1936 سے شروع ہوتا ہے۔ بہار میں اردو کے پہلے افسانہ نگار مسلم عظیم آبادی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ساقی عظیم آبادی اور جمیل مظہری بھی افسانے لکھ رہے تھے۔ جمیل مظہری کا افسانہ ''فرض کی قربان گاہ''، رسالہ ''ندیم''، گیا میں شائع ہوا۔ مسلم عظیم آبادی کا افسانہ ''محبت وجاہ وثروت کی کشمکش'' کے عنوان سے ''الناظر'' لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اسی دور میں زبیر احمد تمنائی کا افسانہ ''سماج کی قربان گاہ پر''، حبیب اللہ جھٹکیاوی کا افسانہ ''قربان گاہ رسم پر ایک بھینٹ'' اور سید مظہر الحق قادری کا افسانہ ''سوسائٹی کی قربان گاہ پر'' کے نام سے شائع ہوئے۔

جہاں تک بہار میں فکشن افسانہ نگاروں کا معاملہ ہے تو اردو کی پہلی خواتین ناول نگار رشیدۃ النساء جو پٹنہ کی رہنے والی تھیں۔ انھوں نے 1881 میں ''اصلاح النساء'' کے نام سے ایک ناول لکھا۔ جو 1894 میں ان کے صاحبزادے نے شائع کرایا۔

اب تک کی تحقیق کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شکیلہ اختر بہار کی پہلی خواتین افسانہ نگار ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ بعنوان ''رحمت'' 1936 میں رسالہ ''ادبِ لطیف'' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اب تک ان کے چھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (1) درپن، (2) آنکھ مچولی (3) ڈائن، (4) آگ اور پتھر (5) لہو کے مول (6) آخری سلام۔ ان کا ایک ناولٹ ''تنکے کا سہارا'' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ شکیلہ اختر کے مشہور افسانوں میں ''آنکھ مچولی''، ''ڈائن''، ''پیاسی نگاہیں''، ''گھریا ویرانہ''، ''سیندور کی ڈبیا''، ''موسی''، ''دلجیا''، ''کیڑے'' اور مظلوم وغیرہ ہیں۔ موضوع ومواد، زبان و بیان، کردار ومکالمے، مناظر وماحول وغیرہ پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ جزئیات نگاری میں بھی کمال رکھتی ہیں۔ ''ڈائن'' میں تلخ حقیقت نگاری اور ''نئی نسل'' میں اخلاقی قدروں کی پامالی کو پیش کیا گیا ہے۔ ''پیاسی نگاہیں'' میں ایک بیوہ عورت کے درد کو بیان کیا گیا ہے۔ ''آنکھ مچولی'' ایک نفسیاتی افسانہ ہے جس میں پروین کے کردار کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

شکیلہ اختر کے بعد نسیمہ سوز اور رضیہ رعنا نے بھی افسانے لکھے ہیں۔ نسیمہ سوز کے افسانے رسالہ ''ندیم''، ''سہیل'' گیا اور ''ادبِ لطیف'' لاہور میں شائع ہوئے۔ بعد میں نسیمہ سوز پاکستان چلی گئیں اس لیے ان کی تخلیقات بہت کم نظروں سے گزری ہیں۔ رضیہ رعنا بھی چند افسانے لکھنے کے بعد شاعری کی طرف چلی گئیں۔

خواتین افسانہ نگاروں میں اعجاز شاہین، نعیمہ قمر، عصمت آرا، نصرت آرا، امتیاز فاطمی، شمیم افزاء قمر، شمیم صادقہ وغیرہ نے کئی اچھے

افسانے لکھیں۔ اس دور کا آغاز 1960 سے ہوتا ہے۔

شمیم صادقہ اس دور میں ایک اہم افسانہ نگار کے روپ میں اُبھرتی ہیں۔ ان کے مشہور افسانوں میں ''کرچیاں''، ''لت'' اور ''ڈیڈ ہاؤس'' کو شمار کر سکتے ہیں۔ شمیم صادقہ نے موضوع سے زیادہ اسلوب پر دھیان دیا ہے۔ آدھے ادھورے چہرے، تنہائی کا کرب، ذات کی شناخت کا مسئلہ اور اس کی اہمیت ان کے افسانوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے افسانے ایک نئے منظر نامے کا پتہ دیتے ہیں اور یہ محسوس کراتے ہیں کہ کس طرح عورتیں مردوں کے مقابلے میں کھڑی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ممتاز افسانہ نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے ''کرچیاں'' 1979 ''ادھورے چہرے'' 1980 اور ''طرح دیگر'' 1984 میں شائع ہوئے۔ شمیم صادقہ کا افسانہ ''ڈیڈ ہاؤس'' میں ایک بوڑھے اور بوڑھی کی کہانی پیش کی گئی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ ہندوستان میں ڈیڈ ہاؤس کی کوئی ضرورت نہیں لیکن افسانہ کے آخر میں اس کا بیٹا اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ''ڈیڈ ہاؤس'' بھی نہیں ہے جہاں وہ اپنی بقیہ زندگی گزار سکے۔ بوڑھے والدین کے درد کو شمیم صادقہ نے بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

اعجاز شاہین خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ 1962 سے ان کے افسانے رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''تصور اور تصویر'' 1975 میں اور ''یہ وادیاں'' 1983 میں شائع ہو چکے ہیں۔ اعجاز شاہین کا اندازِ بیان بے حد خوبصورت ہے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اعجاز شاہین نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو اکثر اوقات بڑے خوبصورت انداز میں کہانی کا رنگ دے دیا ہے وہ خود اعتراف کرتی ہیں:

> ''میرے اکثر افسانے کا موضوع بے بس مظلوم عورت ......بے چاری عورت جو سراپا ایثار و فا ہے اکثر غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس نے اپنا حق پا لیا۔''

اعجاز شاہین کے افسانوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی تلخ سچائیاں پوشیدہ ہیں۔ ان کے نمائندہ افسانوں میں ''دو بوند آنسو''، ''تصور اور تصویر''، ''درد لا دوا''، ''شیشہ کی دیوار''، ''کچی کلی'' اور ''آئینہ'' وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ دونوں افسانوی مجموعے پر اعجاز شاہین کو بہار اردو اکاڈمی نے انعامات سے نوازا تھا۔

اسی زمانے میں عصمت آرا نے بھی چند خوبصورت افسانے اردو کو دیے ہیں۔ ان کے افسانے ''دودھ کا جلا''، ''خول''، ''بابل کے گیت''، ''ستاروں کی موت'' اور ''گردِ کارواں'' اہم ہیں۔ ان کا کوئی بھی افسانوی مجموعہ سامنے نہیں آیا ہے۔ افسانہ ''گردِ کارواں'' میں عصمت آرا نے لڑکیوں کے مزاج اور ان کی پسند ناپسند کو بہت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانہ ''بابل کے گیت'' میں شادی بیاہ کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔

نصرت آرا بھی اردو کی ایک اہم افسانہ نگار تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''درد کا رشتہ'' 1973 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں کل سولہ افسانے شامل ہیں۔ نصرت آرا کے نمائندہ افسانوں میں ''درد کا رشتہ''، ''چوٹ''، ''باغی''، ''چنگاری کی آنچ''، ''کانٹے''، ''داغ'' اور ''قاتل'' وغیرہ ہیں۔ نصرت آرا نے بہت خوبصورت افسانے لکھے ہیں۔ اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

نعیمہ قمر نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا تو ان کے افسانے ''آج کل''، ''ایوان اردو'' اور ''شاعر'' جیسے رسالوں میں شائع ہوئے لیکن بہت جلد افسانوی افق سے وہ غائب ہو گئیں۔ ان کے مشہور افسانوں میں ''یادوں کا چراغ''، ''طوفان کے بعد'' اور ''خواب اور حقیقت'' وغیرہ ہیں۔ ان کے افسانے جدید طرز کے ہوتے تھے زبان و بیان پر مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے وقت کے موجودہ سماجی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

ذکیہ مشہدی اردو کی معتبر افسانہ نگار ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پرائے چہرے'' 1984 میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''تاریک راہوں کے مسافر'' 1993 ''صدائے بازگشت'' 2003 ''نقش نا تمام'' 2008 ''یہ جہان رنگ و بو'' 2013 اور ''آنکھن دیکھی'' 2015 میں منظر عام پر آ چکے ہیں اس کے علاوہ ان کے دو ناولٹ ''پارسا بی بی کا بگھار'' اور ''بلھا کہ جاناں میں کون'' بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ذکیہ مشہدی کے مشہور افسانوں میں ''ماں''، ''بکسا''، ''ہدو کا ہاتھی''، ''نبڈا نہیں مری''، ''بھیڑیئے سیکولر تھے''، ''منظور وا''، ''اجن ماموں کا بیٹھکہ'' اور ''ہر ہر گنگے'' کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ذکیہ مشہدی نے گھر اور آنگن کو اپنے افسانوں میں اس طرح سمیٹا ہے کہ وہ گھر آنگن نہ ہو کر ایک دنیا معلوم ہوتی ہے۔ افسانہ ''ماں'' میں ایک غریب عورت کی کہانی ہے جو اپنے محسن کو اپنا سب کچھ سونپ دیتی ہے لیکن اس کا محسن اسے گناہ سمجھتا ہے اور اس کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ ''ہدو کا ہاتھی'' میں اقدار کی پامالی کو پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ ''بھیڑیئے سیکولر تھے'' میں کئی ڈائمنشن نکلتے ہیں۔ افسانہ کی شروعات ساس سسر اور بہو کے رشتے کی تلخی سے ہوئی ہے ساس سسر مزاجاً سخت ہیں جو بہو کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں۔ ایک

عورت جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک اجنبی گھر پریوار میں آتی ہے اور اُسے وہ عزت نہیں ملتی جس کی وہ مستحق ہے تو اس کے اندر کی عورت ٹوٹ جاتی ہے۔ سروجا کولہو کے بیل کی طرح کام میں لگی رہتی ہے اور جب وہ اپنے بیٹے مہیش کو سوتا ہوا چھوڑ کر ساگ دھونے چلی گئی اور جب واپس آئی تو اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر بھیڑیا اس کے بچے کو لے کر بھاگ گیا۔ بڈّا نہیں مری'' کا آغاز'' گاؤں کی مشترکہ تہذیب کی منظر نگاری سے ہوتا ہے۔ صفیہ افسانہ کا بنیادی کردار ہے جس کے گرد افسانہ گھومتا ہے۔ اس کی سہیلی ودھیا عرف بڈّا ابھی افسانہ میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے جو ہندو گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ دونوں میں گہری دوستی ہے۔ دونوں کی شادی ہو جاتی ہے لیکن اب گاؤں کا ماحول بدل چکا ہے۔ نظریات میں تبدیلی آچکی ہے۔ گاؤں میں مذہبی جھگڑے پھیل رہے ہیں۔ گاؤں آنے پر صوفیہ بڈّا کے بھائی سے ملنے جاتی ہے کیونکہ بڈّا مر چکی ہے۔ بڈّا کے بھائی کی تنگ نظری کو دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ مصنفہ نے بدلتے حالات کی بہت خوبصورت عکاسی کی ہے۔

قمر جہاں اردو کی اہم افسانہ نگار ہیں۔ اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''چارہ گر''، ''اجنبی چہرے'' اور ''یادنگر'' کے علاوہ کئی تنقیدی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ قمر جہاں کے افسانوں میں آج کی زندگی اور موجودہ عہد کے سائنسی ترقیوں کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بقول اقبال واجد:

> ''ہم قمر جہاں کو کسی بھی ازم کے خانہ میں رکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ بلا شبہ ایک Genuine فن کار ہیں جو خود اپنی تخلیقی تشکیل پر رواں دواں ہیں......انہوں نے 1980 کے بعد اردو افسانے میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ یہ پہچان اُن کی اپنی دریافت بھی ہے۔ اور ان کا اپنا طرز نشان بھی۔''

شمیم افزاء قمر اردو کی اہم افسانہ نگار تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کا افسانہ ''دل کا کیا رنگ کروں'' بے حد مقبول ہے۔ ''وش کنیا''، ''زیر لب'' اور ''کاغذی پیرہن'' ان کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''کاغذی پیرہن'' اور ''سب خیریت ہے'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان دلکش اور صاف ستھرا ہے۔ افسانہ ''دل کا کیا رنگ کروں'' میں مدعولیکا اور امرجیت کی کردار نگاری کمال کی ہے۔ بقول کلام حیدری یہ افسانہ کسک کا افسانہ ہے۔

تبسم فاطمہ کے دو افسانوی مجموعے ''لیکن جزیرہ نہیں'' 1995 اور ''تاروں کی آخری منزل'' 2012 میں شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے مجموعے کے مقابلے دوسرا مجموعہ ہر اعتبار سے بہتر اور خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ''تاروں کی آخری منزل'' کے نام میں بھی کشش ہے۔ موضوع میں نئے پن کے ساتھ اسلوب میں بھی ہنر مندی اور قاری کو آسانی سے اپنی گرفت میں لینے کا انداز نمایاں ہے۔ تبسم فاطمہ کے یہاں باغیانہ تیور دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سوئی ہوئی عورت کو جگانا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ عورت اپنے حق کے لیے لڑے اور نئی ایجادات کو نہ صرف اپنی زندگی میں شامل کرے بلکہ مردوں سے بھی آگے نکل جائے۔ افسانہ ''جرم''، ''تاروں کی آخری منزل''، حصار شب کا طلسم'' اور ''ندامت'' وغیرہ ان کے کامیاب افسانے ہیں۔

تسنیم کوثر کا ایک افسانوی مجموعہ ''بونسائی'' 1995 میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں میں عورت کا ایک نیا روپ سامنے آتا ہے۔ ''بونسائی''، ''ملیچھ''، ''مہاجر''، ''انوکھا رشتہ'' اور ''گردشِ ایام'' ان کے مشہور افسانے ہیں۔ ان کا اسلوب ان کے ہم عصروں سے علیحدہ ہے۔ کہانی کہنے کا فن بھی انھیں آتا ہے اور نبھانا بھی۔ حالانکہ انھوں نے بہت کم افسانے لکھے لیکن بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اہم افسانہ نگار تسلیم کی جاتی ہیں۔

عنبری رحمٰن کا ایک افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر آچکا ہے۔ عنبری رحمٰن نے اپنے افسانوں میں مردوں کی نفسیات اور ان کی ذہنیت کا بھرپور مطالعہ کیا ہے۔ ان کے مشہور افسانوں میں ''آخر میں بھی انسان ہوں''، ''کسوٹی''، ''چڑیوں کا چمپا'' اور ''میرا فیصلہ'' ہے۔ وہ عورت کو مجبور اور بے بس دیکھنا نہیں چاہتیں بلکہ عورت کے اندر توانائی پیدا کرنا چاہتی ہیں۔

تسنیم کوثر کی ہی معاصر نکہت پروین بھی ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''سلسلے درد کے'' 1997 میں منظرِ عام پر آیا اور ادبی حلقے میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ''رشتوں کے گیت''، ''سلسلے درد کے''، ''پتھر کا آدمی''، اور ''بوجھ'' وغیرہ ان کے مشہور افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

زینب نقوی کا تعلق سیوان سے ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ریت کی دیوار'' 2004 میں شائع ہوا جس میں کل 15 افسانے شامل ہیں۔ زینب نقوی کے افسانے کے موضوعات عام زندگی سے لیے گئے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات کو اس طرح افسانے میں ڈھال دیتی ہیں کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے مشہور افسانوں میں 'مہندی آپ کی'، 'زیور ہمنی مون'، 'اپنا پرایا'، 'خوشی کے آنسو' اور 'ریت کی دیوار' ہیں۔

نزہت پروین کا پہلا افسانہ 'گردان' کے نام سے 1972 میں شائع ہوا۔ وہ 1972 سے لگاتار لکھ رہی ہیں۔ 'گردان'، 'اندھیرے

کاسفر'،'روشن اندھیرا'اور'تاش کے پتے'ان کے مشہور افسانے ہیں۔

نزہت نوری1941 میں گیا میں پیدا ہوئیں۔ان کا پہلا افسانہ 1969 میں بیسویں صدی ،دہلی میں شائع ہوا۔وہ تقریباً سبھی بڑے اور معیاری رسالوں میں شائع ہوچکی ہیں۔'سبز نقش'،'شیشے کا چاند'،'روشنی اور ریزے'،'سناٹا'ان کے مشہور افسانے ہیں۔

شیریں نیازی کا افسانوی سفر1960 کے آس پاس شروع ہوا۔انھوں نے تقریباً دوسو افسانے لکھے ہیں۔وہ عام زندگی کو اپنے افسانے کا موضوع بناتی ہیں۔ریزہ ریزہ ،ایک پتہ پت جھڑ کا،ٹوٹے شیشے کا درپن،فسانہ شب تاران کے مشہور افسانے ہیں۔

امتیاز فاطمی کا افسانوی مجموعہ'ڈوبتی شام'1993 میں شائع ہوا۔انھوں نے عورتوں کے دکھ درد کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔وہ عورتوں کو تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتی ہیں تاکہ ایک نئے سماج کی تشکیل ہوسکے۔'مٹی کے دیئے'،'شمع فروزاں'،'امربیل'اور'گھر کا چراغ'ان کے اہم افسانے ہیں۔

صبوحی طارق کا پہلا افسانہ'جنگلی پھول'کے نام سے'سالنامہ عفت کراچی1962 میں شائع ہوا۔وہ پابندی سے لکھتی رہی ہیں اور ملک کے اہم اور معیاری رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ان کا ایک افسانوی مجموعہ'درد کا گلاب'1986 میں شائع ہوا۔'تم زلیخا ہو'،'درد کا گلاب'،'تنہائی کا زہر'،'شعلوں کی لپک'ان کے مشہور افسانے ہیں۔

ذکیہ مشہدی اور قمر جہاں کے بعد اشرف جہاں مقبول افسانہ نگار تسلیم کی جاتی ہیں۔وہ پٹنہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو بھی رہ چکی ہیں۔ان کا افسانوی مجموعہ'شناخت' کے نام سے1997 میں شائع ہوا۔ اشرف جہاں کے افسانوں میں عورت کی شناخت کا مسئلہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔وہ عورت کو مختلف زاویے سے دیکھتی ہیں۔'وہ شام'،'شناخت'،'موم کی مریم'اور'فکر آگہی'ان کے مشہور افسانے ہیں۔

نشاط افزا نے1964 سے لکھنا شروع کیا۔ان کا افسانوی مجموعہ 'آخر بہار آئی'1994 میں شائع ہوا۔ان کے یہاں گھر آنگن کی کہانی ہے۔موضوعات کا تنوع ہے اور لڑکیوں کے ذہنی انتشار کو بہت خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔'چاہت کی رہگزر'،'جن پر تکیہ تھا'،'آخر بہار آئی'ان کے مشہور افسانے ہیں۔

کہکشاں پروین کا پہلا افسانہ1979 میں شائع ہوا۔ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ'ایک مٹھی دھوپ'1986 میں منظر عام پر آچکا ہے۔انھوں نے اپنے سماج ،ماحول اور تہذیب کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔'ایک مٹھی دھوپ'،'تلاش'،'سمجھوتہ'اور 'پھول کا زخم'ان کے اہم افسانے ہیں۔

آشا پربھات بہار کی اہم افسانہ نگار تسلیم کی جاتی ہیں۔ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔انھوں نے بہت کم وقت میں اپنی پہچان بنائی ہے اور اردو فکشن میں اپنی اہمیت کا لوہا منوایا ہے۔آشا پربھات کے بغیر بہار میں اردو افسانے کی تاریخ نہیں لکھی جاسکتی۔

امروز جہاں نے اپنا افسانوی سفر1982 سے شروع کیا۔ان کا ایک افسانوی مجموعہ'جذبوں کی آگ'1990 میں منظر عام پر آچکا ہے۔'گھر کا اندھیرا'،'زخمی کلی'،'شکست آرزو'،'جذبوں کی آگ'اور'بزدل' ان کے مشہور افسانے ہیں۔

شگفتہ عارف کا ایک افسانوی مجموعہ'ہنستے زخم'1990 میں شائع ہوچکا ہے۔ان کے کردار اور موضوعات بالکل سامنے کے ہوتے ہیں جن سے ان کا روز سابقہ پڑتا ہے۔ٹھیلہ والا،ضمیر کی آواز، کہرا اور ہنستے زخم ان کے اہم افسانے ہیں۔

ناہید اختر نے بہت کم افسانے لکھے لیکن اپنے اسلوب کی وجہ سے اردو افسانے میں ایک اہم مقام بنایا۔'نارسائی کا دکھ'،'پپو کا جنم دن'، اور 'اماں جی'ان کے اہم افسانے ہیں۔

عامرہ فردوسی نے1984 سے افسانہ لکھنا شروع کیا۔ابھی تک ان کا کوئی بھی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔'خواب ریزہ ریزہ'،'زخمی کلی'،'بیٹی'،'دیوار'اور'سویرا'ان کے اہم افسانے ہیں۔

محمودہ نغمی تقریباً پچیس سال سے افسانے لکھ رہی ہیں۔ان کے افسانوں میں مسلم معاشرے کے مسائل نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ان کا کوئی بھی افسانوی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہے۔

کہکشاں انجم 1968 سے لکھ رہی ہیں۔'یادوں کے چراغ'، 'انتظار کے قیدی'،'پتھر کے گلاب'اور'نئی سحر'ان کے مشہور افسانے ہیں۔

اس کے علاوہ بے بی موتی ناز پوری، نیلوفر پروین، نسرین ترنم، اور حُسن جبیں شکیل نے بہار کی اردو افسانہ نگاری کے فروغ میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

□□□

Rehana Parvin

Diamond Moble Care

Opp: UCO Bank

Gaya-823001 (Bihar)

Mob: 7903952526

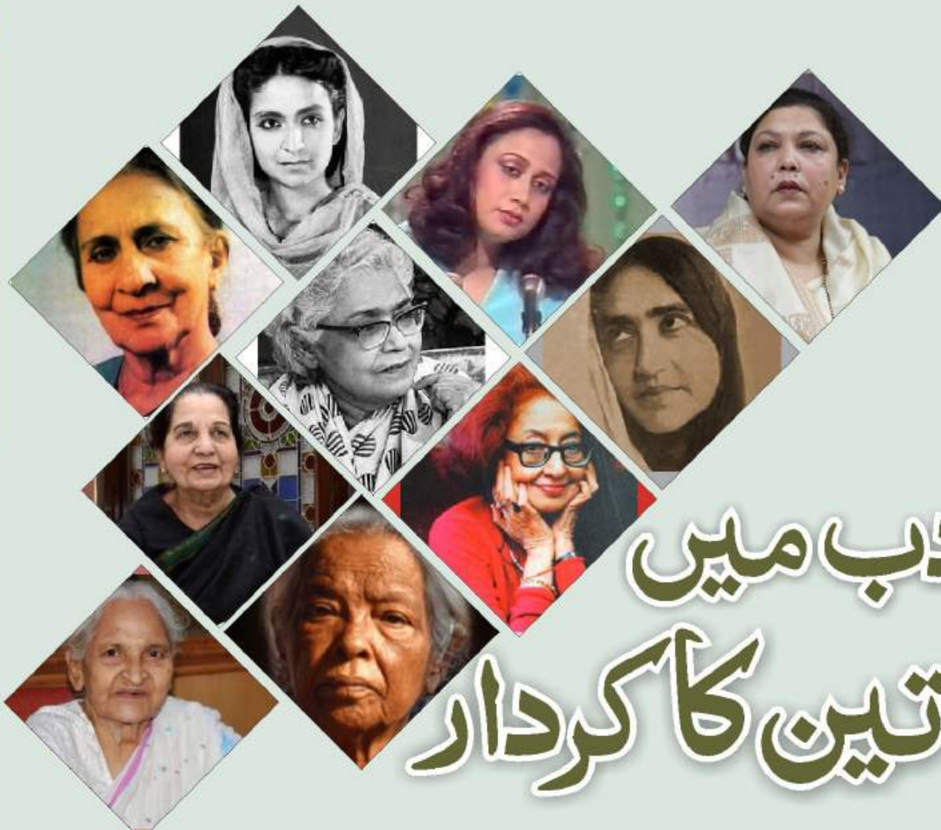

اردو ادب میں خواتین کا کردار

صباز ہرا رضوی

یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں خواتین نے اپنی نمائندگی کو یقینی بنایا ہے لیکن ادب سے ان کی دلچسپی اس لیے زیادہ رہی ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور اس آئینے میں خواتین کا چہرہ نظر نہیں آتا تو ادب بے مایہ ہو جاتا۔ زندگی کی طرح ادب کا محل بھی وجودِ زن سے قائم ہے۔ اس حقیقت کے باوجود اردو ادب کے تناظر میں خواتین کا چہرہ ایک زمانے تک گرد و غبار سے ڈھکا رہا۔ ہمارے ملک میں صنف نازک سے تغافل کی پرانی روایت رہی ہے۔ اردو ادب کے آغاز میں بھی اس روایت کی پاسداری نظر آتی ہے۔ اردو کے تعلق سے اب یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان کے ابتدائی نقوش دہلی اور اطراف دہلی میں ملتے ہیں جبکہ اردو ادب کے ابتدائی نقوش دکن کی سرزمین میں نظر آئے۔ دکن میں اردو ادب کا جو ابتدائی سرمایہ ہے اس میں خواتین بطور مصنف اور شاعر نظر نہیں آتی ہیں لیکن بطور سرپرست ان کی خدمات نمایاں ہیں۔

اُردو ادب میں خواتین کے بڑھتے رجحان کی نشاندہی دو سطح پر کی جا سکتی ہے۔ ایک تصنیف و تالیف اور تخلیق کی سطح پر اور دوسری بطور قاری حصہ داری کے طور پر۔ ہر دو سطح پر خواتین کی حصہ داری کا رجحان بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے ہی زیادہ واضح نظر آنے لگا۔ ادب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اردو ادب پڑھنے کا رجحان بھی خواتین میں تیزی سے بڑھا ہے جو کہ ایک خوش آئند بات ہے۔ اکیسویں صدی کی اِن دو دہائیوں میں تو خواتین نے اردو ادب کے منظر نامے پر اپنی بھرپور اور بامعنی موجودگی درج کرائی ہے۔ نئی مواصلاتی ٹیکنالوجی کے عام ہونے سے بھی خواتین میں اردو ادب پڑھنے کا رجحان بڑھا ہے۔ رسائل و جرائد کے آن لائن ایڈیشن نے خواتین میں اردو ادب پڑھنے کے شوق کو پروان چڑھایا ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری و چوتھی دہائی میں جب ہندوستان میں ریڈیو کا چلن عام ہونے لگا تو یہ بات سامنے آئی کہ اب کتاب و رسائل پڑھنے کا چلن ختم ہو جائے گا یا کم ہو جائے گا۔ لیکن جس رفتار سے ریڈیو نے ترقی کی اسی رفتار سے اردو ادب کی کتابیں بھی منظر عام پر آنے لگیں۔

دنیا ترقی کی راہوں پر آگے بڑھ رہی ہے۔ قوم تہذیب کی بلندیوں کے نزدیک پہنچ رہی ہے۔ سماج وسیع النظر ہو رہا ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو رہا ہے۔ معاشرہ ترقی یافتہ ہونے پر فخر محسوس کر رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ خواتین ہمیشہ اور ہر دور میں فعال رہی ہیں اور انھوں نے ہر میدان میں اپنی عظمت کے پرچم کو بلند کیا ہے۔ خواتین نے اپنی فضیلت، حیثیت، صلاحیت کو ہمیشہ تسلیم کرایا ہے۔

اردو کی بقاء میں خواتین نے اہم رول ادا کیا ہے۔ تاریخ ادب اردو کا جائزہ لیا جائے تو اردو ادب میں خواتین اہم کردار ادا کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ بات دیگر ہے کہ بعض وجوہات کی بنا پر لاتعداد خواتین کے نام، ان کی کوششیں، صلاحیتیں منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔ پروین شاکر، عفت موہانی، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر، عطیہ پروین، ہاجرہ شکور، بانو سرتاج، عصمت چغتائی، امرتا پریتم، مسرور جہاں، رفیعہ منظور الامین، صغریٰ مہدی، امراؤ جان ادا، زہرہ نگاہ، ساجدہ زیدی، انجم رہبر اور واجدہ تبسم اردو ادب کے وہ نام ہیں جن پر اردو کو ناز ہے۔

اردو شاعری ہو یا دنیا کی دوسری زبانوں کی شاعری، اس میں خواتین کا حصہ کم ہے، لیکن ہندوستان میں بالغ نظر شاعرات کا فقدان نہیں ہے۔ پروفیسر زاہدہ زیدی، پروفیسر ساجدہ زیدی کی ادبی خدمات مردوں سے کم نہیں ہیں، ڈاکٹر رفیعہ شیخ عابدی، پدم شری ممتاز مرزا، عزیز بانو داراب و فا علم وادب کا بڑا نام ہیں۔ مسعودہ حیات، جمیلہ بانو، نسیم مخموری، شہناز نبی، نسرین نقاش، ملکہ نسیم، ڈاکٹر نسیم نکہت، ریحانہ نواب، ڈاکٹر ذکیہ انجم شاعرات اپنی ادبی شناخت رکھتی ہیں۔ مشاعروں کے حوالے سے ساحرہ قزلباشی، تسنیم صدیقی، ترنم کانپوری، ثریا رحمانی، انجم رہبر، حنا تیموری، شانتی صبا، عارفہ شبنم، ریحانہ شاہین، سنبل فیضانی، ایکتا شبنم نے اپنا مقام بنایا ہے۔ ان کے علاوہ نزہت پروین بھاگلپور، رباب جعفری بمبئی، سیدہ شان معراج شاہجہانپوری، بیگم ممتاز امید بھوپال، نصرت مہدی، بشریٰ پروین علی گڑھ، ممتاز نازاں (بمبئی)، علینہ عترت (نوئیڈا)، پروفیسر مہ جبیں سیتا مڑھی، فہمیدہ ناز مالیگاؤں، بیگم ممتاز بنگار پیٹ، نمی رضا پورنیہ، سیدہ نسرین نقاش نوا کول سری نگر، حنا نیازی برنپور (مغربی بنگال)، تبسم پرویز سنبھل، شگفتہ طلعت، سیما کولکاتہ، فاطمہ تاج حیدرآباد، راشدہ رخسانہ کودگ (ایم پی)، ڈاکٹر شبانہ نذیر (نئی دہلی)، ڈاکٹر عفت زریں، سعدیہ انصاری (بمبئی)، سیدہ عنوان چشتی، صبوحی پروین (مونگیر)، قریشہ بانو روحی (لکھنؤ)، صابرہ نکہت (لکھنؤ)، عظیمہ نشاط نگینوی (نگینہ)، غزالہ مسرور (چمپارن)، حنا انجم (بلرام پور)، قمر قدیر ارم، بینا نقوی (مرادآباد)، صبا بلرامپوری (بلرام پور) وغیرہ خواتین اردو شاعری میں طبع آزمائی کر رہی ہیں۔

اردو شاعری میں اودھ کی شاعرات کا بڑا نام ہے۔ وقار فاطمہ اختر جائسی، انیس بانو انیس لکھنوی، پارسا لکھنوی، سیدہ خیر النساء بہتر، معصومہ تسنیم ملیح آبادی، جانی بیگم، جعفری لکھنوی، دلہن فیض آبادی، خورشید لکھنوی، کنیز فاطمہ حیا لکھنوی، حور لکھنوی، حسر ماں خیرآبادی، شیبہ لکھنوی، شیریں لکھنوی، زینت زہرہ خیرآبادی، زیبا کاکوری، مہک لکھنوی، ناز سندیلوی، نہار ردولوی، ناز لکھنوی وغیرہ کے نام اودھ کی شاعرات کی تاریخ میں بمع کلام ملتے ہیں۔ اردو ادب کی ابتداء میں خواتین شاعری کا بڑا ذخیرہ ہے۔

افسانہ نگاری کی شروعات بیسوی صدی میں ہوئی۔ افسانہ نگار خواتین کو ہندوستان کے ادب کا منظر نامہ فراموش نہیں کر سکتا ہے ڈاکٹر رشید جہاں اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے بعد حجاب اسمٰعیل اور نذر سجاد حیدر کے افسانے اردو میں نظر آئے۔ اردو افسانہ نگاری میں عصمت چغتائی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی نے بھی کئی اردو افسانے لکھے۔ شکیلہ اختر کے افسانوں کی کتاب ''درپن'' اردو افسانہ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ اردو کی منفرد افسانہ نگار قرۃ العین حیدر نے اردو ہی نہیں، ہندوستانی ادب کے فکشن میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر کے افسانے ترقی پسندانہ نظریات کے حامل ہیں۔ صالحہ عابد حسین اردو کی موقر افسانہ نگار ہیں۔ سلمٰی صدیقی نے متوسط طبقہ کی زندگی پر افسانے لکھے۔ ان کے علاوہ حیدرآباد کے فرخندہ باد کی جہاں بانو نقوی، زینت ساجدہ، نجمہ نگہت کے نام سامنے آتے ہیں۔ جیلانی بانو ترقی پسند تحریک کی پروردہ ہیں۔ حیدرآباد کی مشہور افسانہ نگار واجدہ تبسم کے افسانے موضوع سخن بنتے رہے۔ عفت موہانی، آمنہ ابوالحسن، رفیعہ منظور الامین، الطاف، کوثر جہاں، وسیم بانو قدوائی، فرحت جہاں، کشور جہاں، سعیدہ سلمٰی، ڈاکٹر شمیم نکہت، حمیرہ اقبال، حسن بانو، صائمہ ضنور، مہناز وغیرہ کے نام نمایاں طور پر آتے ہیں۔

ناول ادب کی انتہائی اہم صنف ہے۔ خاتون ناول نگاروں نے بیسوی صدی کے آغاز میں ناول کی تخلیق کی۔ آج کئی خاتون ناول نگار بین الاقوامی شہرت کی مالک ہیں۔ ابتدائی خاتون ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں عورتوں کے بنیادی مسائل کو جگہ دی ہے۔ اس ضمن میں محمدی بیگم کے ناول ''آجکل''، ''سگھڑ بیٹی'' اور ''شریف بیٹی'' طیبہ بیگم کا ناول ''انوری بیگم'' قابل ذکر ہیں۔ نذر سجاد کا ''اختر النساء'' میں عورتوں کی تعلیم و تربیت پر کافی زور دیا گیا ہے۔

عطیہ پروین اور بشریٰ رحمٰن اس دور کی مقبول ناول نگار ہیں۔ مسرور جہاں کا ناول اجالے، اچانک، عفت موہانی کا ناول بھور، پھول، بینا ناز کا ناول ''بدنام''، دیبا خانم کا ناول ''پتھر کے صنم''، رضیہ بٹ کا ''روپ'' جمیلہ ہاشمی کا ناول ''داغ فراق'' وغیرہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ٹیکنالوجی کی مدد سے آج خواتین جو ادب پڑھ رہی ہیں اس کے اعلیٰ درجہ کے ادب ہونے میں یقیناً شک ہے۔ لیکن ادب کی درجہ بندی ناقدین ادب کا کام ہے۔ ادب عالیہ، لوک ادب، تفریحی ادب، جاسوسی ادب، سرّی ادب، پاپولر لٹریچر یا کوئی بھی ادب پڑھنے کا رجحان اگر خواتین میں بڑھ رہا ہے تو یہ خوش آئند بات ہے۔ خواتین میں اردو ادب پڑھنے کا رجحان جس تیزی سے بڑھے گا اسی تیزی سے ان کی زندگی میں مثبت تبدیلی رونما ہوگی۔ اردو ادب کی جتنی اصناف ہیں ان میں غزل، ناول اور افسانہ ایسی اصناف ہیں جنھیں خواتین دلچسپی سے پڑھتی ہیں۔ قصیدہ، مرثیہ، مثنوی یا سفرنامہ جیسی اصناف عام طور پر وہی خواتین پڑھتی ہیں جنھیں کسی کالج یا یونیورسٹی کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرنا ہو۔ افسانہ اور ناول کا معاملہ یہ ہے کہ بانو قدسیہ، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم اور رضیہ بٹ جیسی فکشن لکھنے

والیوں کی کتابیں آج بھی ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہو رہی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اردو میں ناول نگاری کا آغاز کرنے والے ڈپٹی نذیر احمد اور مصورِ غم کے لقب سے نوازے گئے راشد الخیری جس طرح خواتین کی اصلاح کے لیے ناول اور افسانے لکھ رہے تھے، اس کی آج ضرورت نہیں ہے۔ آج کا سماج، خواتین کے لیے وہ سوچ نہیں رکھتا ہے جو راشد الخیری کے زمانے میں تھا۔ آج کی خواتین اپنے حقوق سے واقف ہیں اور اپنی زندگی کی سمت و رفتار طے کرنے کی قوت اور صلاحیت رکھتی ہیں۔

اردو ادب کی تخلیق میں خواتین نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس پر اکثر گفتگو ہوئی ہے، مضامین اور مقالے لکھے گئے ہیں، کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ کے ہر دور میں خواتین کی حصہ داری رہی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس حصہ داری کا تناسب بہت کم رہا ہے۔ اردو شاعری میں خواتین کی بات آتی ہے تو ہم مہ لقا بائی چندا سے پروین شاکر تک درجنوں نہیں سیکڑوں نام گنوا دیتے ہیں۔ لیکن کیا اردو شاعری کی تاریخ میں میر، غالب اور اقبال کے مقام و مرتبہ کی کوئی شاعرہ نظر آتی ہے؟ شاید نہیں۔ اس کی تاریخی، سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن حقیقت تبدیل نہیں کی جا سکتی ہے۔ شاعری کے مقابلے اردو فکشن نگاری میں خواتین کے کارنامے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ بات پاپولر ادب کی ہو یا اعلیٰ ادب کی، ہر دو سطح پر خواتین نے اپنی ناقابل فراموش موجودگی درج کرائی ہے۔ رضیہ بٹ، بشریٰ رحمٰن، عفت موہانی اور واجدہ تبسم جیسی فکشن لکھنے والی خواتین نے اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ ان کے قارئین کی تعداد لاکھوں میں رہی ہے۔ اردو افسانہ اور ناول کے حوالے سے صرف عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کا نام لکھ دیا جائے تو تاریخ کے صفحات پر چاند سورج کی طرح نظر آئیں گی۔ حالانکہ حیدرآباد دکن کی رہنے والی طیبہ بیگم نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہی تین ناول لکھ کر یہ واضح کر دیا تھا کہ اردو فکشن کے میدان میں خواتین بڑے کارنامے انجام دیں گی۔ طیبہ بیگم کے راستے پر چل کے ہی بنت نریندر ناتھ برج کماری، حجاب امتیاز علی، اور نذر سجاد حیدر جیسی خواتین نے اردو ناول کو کچھ نئے موضوعات دیے۔

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک نے خواتین کو ایک نیا پلیٹ فارم عطا کیا۔ لکھنؤ میں ترقی پسند تحریک کے پہلے جلسے میں بطور صدر منشی پریم چند نے جو خطبہ دیا اس نے اردو ادب کی سمت و رفتار کا کسی حد تک تعین کر دیا۔ یہاں منشی پریم چند نے حُسن کا معیار بدلنے کا جو تاریخی جملہ کہا اس نے خواتین کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ ترقی پسند تحریک نے خواتین میں خود اعتمادی پیدا کی۔ انھیں ادب کی دنیا میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ اسی حوصلے نے ڈاکٹر رشید جہاں سے وہ افسانے لکھوائے جن کو پڑھ کر سماج کا ایک طبقہ بلبلا اُٹھا۔ ڈاکٹر رشید جہاں، رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم جیسی فکشن نگاروں نے سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کیا۔ شجرِ ممنوعہ کو چھونے کا حوصلہ دکھایا۔ انھیں کے ساتھ قرۃ العین حیدر اپنی ایک الگ دنیا آباد کرتی ہیں۔ ''یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے'' اور ''فوٹوگرافر'' جیسے لازوال اور شاہکار افسانے لکھ کر قرۃ العین حیدر نے اردو فکشن کو عالمی فکشن میں ممتاز مقام عطا کر دیا۔ اس فہرست میں جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، اور سلمیٰ صدیقی جیسی اعلیٰ پائے کی فکشن نگاروں کے نام بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ سبھی بیسویں صدی کی اہم اردو ادیبائیں ہیں جنھوں نے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ اکیسویں صدی کی دو دہائیوں پر نظر ڈالیں تو اردو ادب کے تئیں خواتین میں جو رجحان بڑھا ہے اس میں جدید موضوعات پر لکھنے والی خواتین کا بہت اہم کردار ہے۔ ذکیہ مشہدی، ثروت خان، صبیحہ انور، ترنم ریاض اور نگار عظیم جیسی فکشن نگاروں نے نئے موضوعات کو اپنے افسانوں اور ناولوں میں جگہ دی ہے۔ نئی نسل کی خواتین میں اردو ادب پڑھنے کا جو رجحان نظر آتا ہے اس کی بڑی وجہ یہی خواتین افسانہ نگار ہیں۔ آج کی خواتین جن مسائل سے دوچار ہیں، ان مسائل کو مرکز میں رکھ کر جو فکشن لکھا جا رہا ہے وہ مقبول بھی ہو رہا ہے اور اس کی معنویت بھی ظاہر ہو رہی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں خواتین کا بڑھتا رجحان ایک خوش آئند بات ہے۔ تخلیق، تحقیق اور تنقید کی سطح پر خواتین آج پہلے سے زیادہ سرگرم نظر آ رہی ہیں۔ حکومت ہند کی جانب سے ''خواتین دنیا'' جیسے رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ خواتین اہل قلم کی اپنی تنظیمیں اردو ادب کے میدان میں سرگرم ہیں۔ بطور قاری بھی خواتین کی سرگرمی قابل ستائش ہے۔ اس رفتار کو ذرا اور بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ اردو ادب میں خواتین کا یہ بڑھتا رجحان کم نہ ہونے پائے۔

□□□

Saba Zehra Rizvi
Zamir Apartment, 1st-Floor
Napier road -2
Near Almaa Marriage hall
Hussainabad Chowk
Lucknow-226003 (U.P)

صبا

عابد سہیل کی صحافت
ماضی اور حال

عابد سہیل اتر پردیش کے مقام اورئی ضلع جالون میں 27 نومبر 1932 کو ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے اور وفات 26 جنوری 2016 کو ممبئی میں ہوئی۔ یوں تو ان کی زندگی ایک باوقار شخصیت کی مالک رہی ہے لیکن دو حصوں میں منقسم بھی رہی ہے۔ جس میں ایک ہے صحافتی زندگی اور دوسری افسانوی زندگی بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک پیشہ ورانہ زندگی جس سے وہ تاحیات وابستہ رہے۔ میں اس مضمون میں اسی پیشہ ورانہ یعنی صحافتی زندگی پر گفتگو کروں گی تاکہ یہ اہم پہلو بھی ہم پر واضح ہو جائے۔ عابد سہیل اپنی اس پیشہ ورانہ زندگی کے بارے میں کچھ یوں رقم طراز ہیں کہ:

"لکھنا پڑھنا میرا شوق رہا اور اپنے شوق کا بکھار کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا لیکن صحافت یا Journalism میری دو وقت کی روٹی تھی۔ سو میں نے اپنی محنت مزدوری کو مزے لے لے کے بیان کیا ہے اور یہ بھی تو دیکھئے کہ میں نے صحافت کن لوگوں کے قدموں میں بیٹھ کے سیکھی؟ ان میں سے ایک تھے حیات اللہ انصاری جن کا ادب میں بڑا امان دان ہے اور دوسرے ایم چلپت راؤ جن کے بارے میں کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ ایک بات اور اس وقت ادب اور صحافت پر Values کی حکمرانی تھی۔" (بحوالہ: نیا دور لکھنؤ، اگست ستمبر 2016، ص 96)

عابد سہیل محض 20 سال کی عمر میں یعنی 1952 میں قومی آواز سے وابستہ ہو گئے۔ باقاعدہ ملازمت کا آغاز سب ایڈیٹر کی حیثیت سے 1957 میں کیا۔ وہاں انھوں نے 1961 تک کام کیا اور پھر انھیں اسی کمپنی کے انگریزی اخبار نیشنل ہیرالڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ کسی اردو صحافی کے لیے یہ اعزاز کی بات تھی لیکن یہ ان کا اپنا کمال تھا کہ وہ دونوں زبانوں کے ماہر تھے۔ یہاں وہ 1985 تک کام کرتے رہے۔ اخیر میں وہ نیوز ایڈیٹر کے عہدے پر فائز تھے ادارے کے حالات اچھے نہیں رہے لہٰذا وہ استعفیٰ دے کر الگ ہو گئے۔ 1995 میں لکھنؤ ہی کے ایک معروف اخبار پائینیر سے جڑے مگر 1997 میں وہاں سے بھی مستعفی ہو گئے۔ یہاں ان کے نظریات کا معاملہ آڑے آ گیا تھا۔ اسی دوران لکھنؤ سے ایک اخبار "صحافت" جاری ہوا جس کے مالکان نے عابد سہیل کو اس کی ادارت کے لیے مدعو کیا جس سے وہ تقریباً چار برسوں تک وابستہ رہے۔ اسی کے ساتھ وہ 'ٹائمس آف انڈیا' میں "اردو پریس" کے عنوان سے ایک کالم بھی لکھتے رہے جس کا سلسلہ 2010 تک جاری رہا۔ عابد سہیل لکھتے ہیں:

"کسی انگریزی اخبار سے متعلق ہونے کی بات میرے خواب

وخیال میں بھی نہ تھی اور نہ میں خود کو اس کا اہل ہی سمجھتا۔ ہائی اسکول کے بعد کلاس روم میں اردو نہ پڑھنے کے باوجود خیال تھا کہ صحافت میں اتنی اہلیت تو پیدا کر ہی لوں گا کہ لشتم پشتم زندگی گزار لوں۔ سچ پوچھیے تو میرے ذہن میں مستقبل کا کوئی نقشہ ہی نہ تھا لیکن قسمت نے زندگی کا کوئی نقشہ ضرور بنا رکھا تھا جو خاصا ٹیڑھا میڑھا تھا اور شاید اس کے روشن ترین مقام کا نام تھا ''نیشنل ہیرالڈ''۔ (جو یاد رہا، عابد سہیل، ص 374)

نیشنل ہیرالڈ اس وقت کا مشہور ترین اخبار تھا جس کے ایڈیٹر ایم سی MC صاحب تھے۔ صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے اور اسی صحافت نے بڑے بڑے تخت و تاج کو اکھاڑ پھینکا ہے لیکن فی زمانہ اس کی نوعیت کچھ بدل گئی ہے۔ آج خبروں کو پیش کرنے کا انداز مختلف ہو گیا ہے۔ یہ تو آج کی صحافت ہے لیکن عابد سہیل کے زمانے کی صحافت میں values کی حکمرانی تھی آج اس values کو ہم موجودہ دور کے values سے موازنہ کر کے دیکھتے ہیں تو کافی فرق نظر آتا ہے۔ عابد سہیل خود ہی اپنے وقت کی صحافت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''صحافت اور خاص طور سے اخباری صحافت کا جن لوگوں کو تجربہ ہے ان کو احساس ہوگا کہ یہ پیشہ انسان کو سخت دل، برخود غلط اور عیب جو بنا دیتا ہے۔ روز ناموں کی صحافت کا سارا ڈھانچہ ہی ایک ایک طرح سے حکومت وقت، اس سے متعلق افراد اداروں اور سیاسی، سماجی اور معاشی نظام میں خرابیاں تلاش کرنے کی بنیاد پر قائم ہے۔''

(جو یاد رہا، عابد سہیل، ص 21)

جس دور میں عابد سہیل ''قومی آواز'' سے وابستہ تھے اس وقت صحافت اور صحافیوں کا ایک خاص معیار تھا۔ جس ایمانداری اور دیانت داری سے کام ہوتا تھا اس سے حکومت وقت بھی صحافیوں سے خوف کھاتی تھی۔ صحافت کے معیار اور رعب و دبدبے کے حوالے سے ایک قصے کا ذکر یہاں مناسب ہے۔ 1789 میں فرانس میں انقلاب آیا اور نیپولین بونا پارٹ فرانس کا تاناشاہ بنا۔ وہ ایک بہادر جرنیل تھا اس وقت کے بڑے بڑے سپہ سالار نیپولین کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن اسے صحافیوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ یہ بات اس نے ایک انٹرویو میں کہی تھی کہ ''اگر مجھے کسی چیز سے ڈر لگتا ہے تو وہ ہے ''صحافی''۔ ایسی تھی اٹھارویں صدی کی صحافت جس سے عظیم سے عظیم تر حکومتیں کانپنے لگتی تھی۔'' عابد سہیل کے مذکورہ بالا اقتباس سے صرف ایک لفظ لیا جائے values جس کا مطلب ہے کسی شے کی قدر و قیمت دراصل اس لفظ (values) کا تہذیبی پس منظر دیکھا جائے اس کا استعمال انھوں نے اس وقت کی صحافت کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرنے کے لیے کیا ہے۔ وہ وقت قومی آواز، نیشنل ہیرالڈ، ٹائمس آف انڈیا اور پائنیر وغیرہ کا تھا۔ لیکن اس دور کے صحافی، صحافت، اخبار اور قاری کا موازنہ موجودہ دور سے کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ویسے آج الیکٹرونک میڈیا کا زمانہ ہے پہلے لوگ صبح کی چائے کے ساتھ اخبار کا مطالعہ کرتے تھے لیکن اب فیس بک، وٹس ایپ، انسٹاگرام اور ٹوئیٹر نے ان کی جگہ لے لی ہے۔

ان چیزوں نے صحافت کو اپنے حصار میں لے لیا ہے آپ جیسے ہی موبائل آن کریں گے فوراً نیوز ایپ کے تھرو آپ کو تازہ خبریں ملیں گی۔ بہرحال خبریں جیسی بھی ہوں بات ذرائع ابلاغ کی نہیں بات ذرائع ابلاغ کے ذریعہ پیش کی جانے والی خبروں کی نوعیت کی ہے کہ آیا ہم تک جو آج خبر پہنچ رہی ہے وہ اہم ہے یا غیر اہم اور اس میں صداقت کتنی ہے میرے لیے مفید ہے یا غیر مفید۔ یہ ایک اہم سوال ہے کہ عابد سہیل کی values آج کے values سے کتنی مختلف ہے۔ عابد سہیل کے زمانے میں صحافتی اخلاقیات کا جو معیار M.C صاحب نے متعین کیا اس کی مثال عابد سہیل اپنی خودنوشت سوانح ''جو یاد رہا'' میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''نیشنل ہیرالڈ سے متعلق ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ ادارتی عملے کے کسی فرد کو کسی دوسرے اخبار میں لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ میرے لیے یہ خبر خاصی پریشان کن تھی کیوں کہ میں نیا دور، آج کل اور دوسرے جرائد میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتا اور اس سے تھوڑی بہت یافت بھی ہو جاتی، چنانچہ میں نے ایم سی سے درخواست کی میں غیر سیاسی، ادبی اور ہندوستانی فلسفہ کے موضوعات پر مضامین ادبی رسائل میں اکثر لکھتا رہتا ہوں براہ مہربانی یہ سلسلہ جاری رکھنے کی اجازت دی جائے۔ ایم سی نے میرے خط پر ہی لکھ دیا۔

"Yes, Abid you may continue to write on literary and philosphical subjects. but I hope you will sell the articles not yourself."M.C.

(جو یاد رہا، عابد سہیل، ص 387)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ پتا چلتا ہے کہ ہر ادارے کی اپنی کچھ اخلاقی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ عابد سہیل ایک ملازم کی حیثیت سے نیشنل

ہیرالڈ جیسے معیاری اخبار میں کام کرتے ہوئے پیشہ معیار کا خیال رکھا اور ہمیشہ اخبار کی پالیسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی خدمات انجام دیں اپنی ایمانداری اور شریف النفسی کی مثال وہ خود کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے اس سلسلے میں ایم۔سی۔اور شاید خود کو بھی کبھی مایوس نہیں کیا 1962 میں ماہنامہ "کتاب" کا اجرا ہوا۔میں اس کی تیرہ چودہ سال کی زندگی میں نیشنل ہیرالڈ جیسے با اثر اخبار سے متعلق تھا۔چاہتا تو اس تعلق کی بنا پر خوب خوب اشتہار بٹورتا اور خسارے کے اس سودے کو اپنی حیثیت بھر کی سونے کی کان میں بدل دیتا۔"

بہرحال عابد سہیل کی دیگر تحریروں پر نقادوں نے خوب لکھا ہے لیکن ان کی زندگی کا اہم پیشہ صحافت جس سے وہ عمر بھر جڑے رہیں کسی بھی نقاد نے یہ انصاف ان کے ساتھ نہیں کیا کہ ان کی زندگی کا یہ اہم گوشہ بھی اجاگر کیا جائے۔عموماً لوگ اپنے پیشے سے وفا نہیں کرتے لیکن عابد سہیل کی صحافتی زندگی کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس پیشے میں کتنا ایماندار تھے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس گوشہ کو بھی منظرِ عام پر لایا جائے جس سے یہ پتا چلے کہ اس وقت کی صحافت کی نوعیت کیا تھی اور عابد سہیل نے جو اپنا ایک معیار بنا رکھا تھا صحافت کی دنیا میں اسے آج کے صحافیوں کو پڑھنے کی ضرورت ہے خواہ وہ پرنٹ میڈیا کے صحافی ہوں یا الیکٹرانک میڈیا کے صحافی۔ انسان کو خود احتسابی کرنی چاہیے اور اچھے لوگوں کو اپنا مشعل راہ بھی بنانا چاہیے۔جس طرح سے آج ہمارے سامنے عابد سہیل کا ماضی ہے اس طرح ہم سبھی اسی ماضی کا حصہ بن جائیں گے اور تاریخ وتہذیب کے اوراق میں دفن ہو جائیں گے پھر آنے والی نسل جب اوراق پلٹیں گی تو ہمارے کارنامے ان کے سامنے آئیں گے۔ چونکہ اس سوسائٹی کا ہر فرد اسی سماج کے تئیں جواب دہ ہے اور ریاست کے چوتھے ستون کو پھر سے ایماندار اور تابناک دیکھنے کا متمنی ہے باوجود اس کے اب بھی کچھ لوگ (صحافی) باقی ہیں جو اس پیشے کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو بہ حسن خوبی انجام دیتے ہیں:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

عابد سہیل کا رشتہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالے "کتاب" سے بھی رہا تھا۔رسالہ لکھنؤ ادبی رسالہ تھا مگر نظریاتی طور پر اس کا رشتہ ترقی پسندی سے تھا۔حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، عابد سہیل اور قمر رئیس جیسے اردو کے نامور ادیب و شاعر "کتاب" کی مجلس ادارت کے ممبر تھے۔

رسالہ کتاب کی کئی خوبیاں تھیں۔وہ اپنے زمانے میں ایک الگ رنگ روپ لے کر شائع ہوتا تھا۔ویسے تو اس رسالے میں ادب کی تمام اصناف شامل ہوتی ہیں مگر اس کا بنیادی مقصد ترقی پسندی کو فروغ دینا تھا۔اس رسالہ کا اداریہ "پہلا ورق" نام سے ہوتا تھا۔اداریے میں عموماً معاصر ادبی منظر نامے پر گفتگو ہوتی تھی مگر جب ہم اداریوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اردو ادب کی پیش رفت کو بیان کرنے کے ساتھ ترقی پسند فکر کی از سر نو ترویج واشاعت بھی کرنا تھی۔عابد سہیل ان لوگوں میں سے تھے جو عصری آگہی سے واقف تھے۔رسالہ 'کتاب' سے ان کی وابستگی اس بات کا بین ثبوت بھی ہے۔رسالہ کتاب کی ایک بڑی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں تخلیق وتنقید کو اہمیت دی جاتی تھی نا کہ کسی نام کو۔یہی سبب ہے کہ اس وقت کے کئی نئے ادیب جو بعد میں اردو دنیا کے ممتاز ادیب کی صف میں شمار کیے جانے لگے،ان کو بھی 'کتاب' میں ہی موقع ملا۔گویا اس رسالے نے نئے ادیب سے ادبی دنیا کو متعارف کرانے کا بھی کام کیا۔رسالہ 'کتاب' سے عابد سہیل کا رشتہ کتنا گہرا ہوگا اس بات کا اندازہ قاضی عبدالستار کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے اس جانب اشارہ کیا تھا کہ عابد سہیل کی بیوی اپنے شوہر سے اس لیے خفا رہتی تھی کیونکہ ان کو لگتا تھا کہ عابد سہیل نے اس رسالے کو نہ صرف گود لے رکھا ہے بلکہ اپنی اکلوتی بیٹی کو بھی وقت نہیں دیتے۔ بہرحال رسالہ کتاب 1975 تک جاری رہا اس دوران اس رسالے کے کئی اہم خاص نمبرات شائع ہوئے۔ان خاص نمبرات میں افسانہ نمبر، علی عباس حسینی نمبر، شوکت تھانوی نمبر، ہندی کہانی نمبر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔جیسا کہ میں نے ذکر کیا یہ رسالہ بنیادی طور پر ترقی پسند رسالہ تھا لہٰذا اس کے شمارے میں ترقی پسند مصنفین کے جلسوں کی روداد بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔

بہرحال عابد سہیل کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ان باتوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ انھوں نے جہاں ایک جانب ادارت کی ذمہ داری نبھائی وہیں دوسری جانب مجلس مشاورت کے ممبر کے طور پر بھی انھوں نے اہم رول ادا کیے ہیں۔عابد سہیل کی صحافتی خدمات کا یہ مختصر جائزہ ہے۔

□□□

Saba

Research Scholar

House No. 356A, Street No:22B

Zakir Nagar, Jamia Nagar

New Delhi-110025

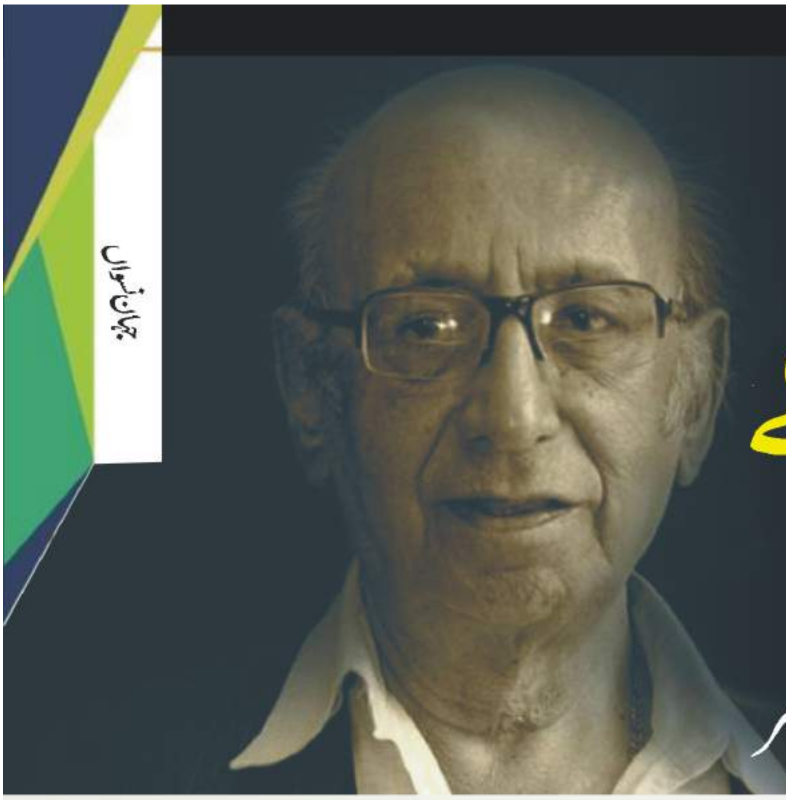

نصرت جہاں

ندا فاضلی کے رپورتاژ

"جشن شاعر" پر ایک نظر

رپورتاژ اردو ادب کی ایک جدید نثری صنف ہے، جس نے ترقی پسند تحریک کے عروج کے ساتھ ساتھ ترقی کی۔ رپورتاژ لفظ انگریزی لفظ ریپورٹ ایج (REPORTAGE) سے ماخوذ ہے، فرانسیسی میں اس لفظ کا تلفظ رپورتاژ ہے، رپورتاژ کا مفہوم ہے: کسی سچے واقعے یا حادثے کی خبر یا رپورٹ اس طرح تیار کی جائے کہ اس میں افسانوی رنگ و آہنگ پیدا ہو جائے، یا اسے ایسے افسانوی رنگ میں بیان کیا جائے کہ اس میں افسانہ وناول کا انداز پیدا ہو جائے، اور ساتھ ہی مصنف کی شخصیت بھی جھلک اٹھے؛ مگر شرط یہ ہے کہ واقعات وحادثات حقائق پر مبنی ہوں۔ عبدالعزیز نے اپنی کتاب ''اردو میں رپورتاژ نگاری'' ص:35 میں سردار جعفری کا مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے:

''خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو ادب کی یہ صنف بھی آہستہ آہستہ مقبول ہو رہی ہے، یہ صنف ادب میں بالکل نئی ہے لیکن بے انتہا اہم ہے، یہ صحافت اور افسانہ کی درمیانی کڑی ہے، اس سے ہمارے ادب کو بے پناہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔''

عبدالعزیز، اردو میں رپورتاژ نگاری، ص۔35، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی، اگست 1977

پروفیسر نورالحسن نقوی اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' ص:410 میں لکھتے ہیں کہ:

''رپورٹ عام طور پر ایک روکھی پھیکی شے ہے، جسے پڑھنا اور سننا ایک صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے، اسے دلچسپ اور خوش گوار بنانے کے لیے اہل قلم نے اس میں افسانے کا رنگ بھرا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی روداد حمید اختر نے ادبی زبان اور محاکاتی انداز میں پیش کر کے اردو داں حلقے کو اس صنف سے روشناس کیا؛ اس لیے ہماری زبان میں وہی اس کے موجد کہے جاتے ہیں''۔

(پروفیسر نورالحسن نقوی، تاریخ ادب اردو، ص۔410، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2010)

ایک رپورتاژ نگار کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ اس کی نظر ان واقعات وحادثات کے ظاہری وباطنی پہلوؤں پر گہرائی سے پڑے، جس پر عوام الناس کی نظریں پہنچنے سے قاصر ہوتی ہیں، پھر وہ اس کا عمیق مشاہدہ سے تجزیہ کرے، ظاہری طور پر رپورتاژ کی ہیئت اصل وہی ہوتی ہے جو افسانہ وناول کی ہوتی ہے۔

رپورتاژ نگاری کی ابتدا اس وقت ہوئی جب ترقی پسند تحریک بام عروج پر تھی اور ہندوستانی جنگ آزادی کی جدوجہد میں سرگرداں تھے، جس میں اردو ادبا وشعرا عملی طور پر حصہ لے کر اپنی تخلیقات سے عوام کو بیدار کر رہے تھے، انجمن ترقی پسند تحریک کے جلسے باقاعدگی سے منعقد ہوتے اور ان کی رپورٹیں تیار کی جاتی تھیں، ان رپورٹوں کی خشکی وبے کیفی دور کرنے کے لیے اسے دل کش افسانوی ومحاکاتی انداز اختیار کیا گیا۔ یہیں سے باقاعدہ رپورتاژ کا آغاز ہوا، اس کا سہرا حمید اختر کے سر ہے اور اسے مقبول عام بنانے میں ''نظام'' ہفتہ وار بمبئی کی کوشش ناقابل فراموش ہے۔

اس طرح اردو رپورتاژ نگاری میں جن بڑے بڑے ادبا وشعرا نے اپنی قلمی کاوش کے گل کھلائے ہیں، ان میں ایک نمایاں نام ندا فاضلی کا بھی ہے، اس مضمون میں موصوف کی رپورتاژ نگاری کا جائزہ لیں گے، یہ رپورتاژ انھوں نے ''جشن شاعر'' کے نام سے قلم بند کیا ہے، اس رپورتاژ

میں مالیگاؤں کے ایک مشاعرہ کی روداد بیان کی گئی ہے، جو ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی کی امداد کے سلسلے میں مالیگاؤں میں منعقد ہوا تھا، جس میں ملک کے مشاہیر شعرا وادبا نے شرکت کرکے چار چاند لگادیے تھے۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

علی سردار جعفری، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، اعجاز صدیقی (ایڈیٹر ماہنامہ ''شاعر'') زبیر رضوی (اناؤنسر) ہلال سیوہاروی، نظر مالیگانوی، عارف عباسی، نگار سلطانہ، صہبا حیدرآبادی، رئیس رام پوری، عتیق احمد عتیق مختار راشد۔

جب ندا فاضلی شعرا کے ساتھ موٹر کار کے ذریعہ بمبئی سے مالیگاؤں کے لیے روانہ ہوئے تو صبح کا وقت تھا، سڑکوں پر بھاگتی ہوئی گاڑیاں، سورج کی روشنی اور دھوپ چھاؤں کا منظر اور خوش گوار ہواؤں نے بڑا فرحت بخش اور جاں فزا ماحول بنا رکھا تھا، اس امنگ بھرے ماحول میں ندا فاضلی کی ذہنی اڑان نے اپنے بال و پر پھیلا دیے اور سب سے پہلے سردار جعفری کی چٹکیاں لیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''سردار جعفری کے بڑے بڑے بال دیکھ کر نہ جانے مجھے کیوں جان ملٹن کا SAMSON یاد آتا ہے، اور نہ جانے مجھے کیوں ڈر لگتا ہے کہ ان بالوں کو کوئی چرالے جائے گا، ان میں چھپی ہوئی شکتی بوڑھے آسمان کی نیلا ہٹوں میں کھوجائے گی، پھر صرف سردار جعفری رہ جائیں، شاید پانچ فٹ ساڑھے چھ انچ''۔

(شاعر، ص۔49، جشن شاعر (رپورتاژ)، از: ندا فاضلی، شمارہ نمبر۔3، مارچ 1967)

دوسرا حملہ اختر الایمان پر ان کی مشہور نظم ''ایک لڑکا'' کے حوالے سے:

> ''اختر الایمان کو بھی دیکھ کر مجھے کچھ اسی قسم کا خوف ستاتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ان سے پوچھوں کہ: وہ ایک لڑکا کہاں ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو، کوئی آئے اور اسے چرالے جائے، اس کی نگرانی کرتے رہیے''۔ (ایضاً۔۔۔ص۔49)

اور پھر ساحر لدھیانوی کا انتظار کرنے کے لیے موٹر کار روک دی، اس طویل انتظار کو ندا فاضلی نے اس طرح قلم بند کیا ہے:

> ''موٹر کار چوراہے کے ایک فٹ پاتھ پر روک دی گئی تھی، اس راستے پر اپنے وعدے کے مطابق ساحر لدھیانوی کو گزرنے کی امید تھی؛ کیوں کہ کچھ دیر پہلے سردار جعفری نے ان سے فون پر بات کی تھی۔ اعجاز صدیقی ایڈیٹر ماہنامہ ''شاعر'' چاہتے تھے کہ سب لوگ ساتھ ساتھ روانہ ہوں؛ مگر ساحر کا دور دور تک پتہ نہیں تھا، سردار جعفری سگریٹ سے سگریٹ سلگا رہے تھے اور بے چارے اختر الایمان اس سے بھی محروم، انھوں نے کچھ دیر بعد جیب سے اپنا دھوپ کا چشمہ نکالا، اسے گھما پھرا کر غور سے دیکھا اور آنکھوں پر لگالیا، پھر اتار کر رومال سے صاف کیا اور دوبارہ پہن لیا، دوبار تھوڑے تھوڑے وقفے سے ڈرائیور کے گنجے سر پر لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور پھر وہی انتظار اور اوباہٹ اور آنکھوں کی گھبراہٹ، سردار جعفری بھی اب دوسری سگریٹ سلگانے کے موڈ میں نہیں تھے''۔ (ایضاً۔۔۔ص۔49)

اس رپورتاژ سے پتہ چلتا ہے کہ ندا فاضلی زندگی کے ہر پہلو پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے، اور کسی بھی شخصیت کا کتنی باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ کرتے تھے اور طنز و مزاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ کر اس شخصیت سے ہمارا تعارف کراتے ہیں، جس سے ہمیں طنز و مزاح کا لطف بھی آئے اور نئی آشنائی سے متعارف و روشناس بھی ہوں۔ ندا فاضلی آگے بیان کرتے ہیں:

> ''گاڑی تیز رفتار سے دوڑ رہی تھی، اکیلی سڑک، انجانے میدان اور اجنبی چہرے کتنے پُراسرار اور اچھے نظر آتے ہیں''

(ایضاً۔۔۔ص۔50)

پھر وہ اختر الایمان اور سرادر جعفری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جو پچھلی سیٹ پر گفتگو میں مگن ہیں، وہ (اختر الایمان) بیزار ماحول کو پُرلطف بنا نے کے لیے کوئی لطیفہ سنا رہے ہیں، اسے ندا فاضلی نے اس طرح قلم بند کیا۔ (اختر الایمان نے اپنے سیاہ رنگ اور اپنی مشہور نظم ''ایک لڑکا'' کے حوالے سے یہ لطیفہ سنایا ہے):

> سردار! کبھی تم نے بھوت دیکھا ہے؟ نہیں، تم نے دیکھا ہے؟ دیکھا تو نہیں، دکھایا ضرور ہے۔ وہ کیسے؟ وہ میں شالیمار پکچرز کے سلسلے میں پونا گیا ہوا تھا، اتفاق سے مجھے وہاں ایسے مکان میں قیام کرنا پڑا، جس کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ اس میں بھوت بستے ہیں، میں دوپہر میں سوتے وقت تہبند باندھتا ہوں، دوپہر ہی کا وقت تھا، میں کھانے سے فارغ ہوکر دروازے پر کھڑا ہوا تھا کہ ایک صاحبزادے سامنے سڑک سے گزر رہے تھے، مجھے دیکھ کر اتر پڑے اور قریب آکر پوچھنے لگے: اس مکان میں آپ رہتے ہیں؟ جی ہاں! اس میں بھوت رہتا ہے، جی ہاں! میں کھڑا ہوا ہوں، یہ سنتے ہی وہ

صاحبزادے سرپٹ بھاگ لیے۔'' (ایضاً۔۔۔ص۔50)

یہ لطیفہ سن کر سردار جعفری قہقہے پر قہقہہ لگا رہے ہیں، ہنس رہے ہیں۔ اختر الایمان بھی ہنس رہے ہیں اور ندا فاضلی یہ لطیفہ سن کر کہہ رہے ہیں:

''اور میں اس لڑکے کے بارے میں سوچ رہا ہوں، جو ڈر کر بھاگ رہا تھا، اس واقعہ کو نہ جانے کتنے سال بیت گئے ہوں گے؛ لیکن مجھے لگتا ہے وہ لڑکا پونہ سے چل کر بمبئی تک آ گیا ہوگا اور کسی نہ کسی دن باندرہ میں بنے اختر الایمان کے نئے سجے سجائے بنگلے کو وہ پھر کھٹکھٹائے گا، ممکن ہے اختر الایمان پھر وہی جملہ ''جی ہاں! میں کھڑا ہوں'' دہرائیں؛ لیکن اس بار وہ لڑکا جانے سے پہلے یہ ضرور کہے گا کہ یہ کذب وافترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں''۔ (ایضاً۔۔۔ص۔50)

اس طرح ندا فاضلی نے پورے رپورتاژ میں شعرا کی چٹکیاں لے لے کر ہمارے روبرو کر کے بڑی بے باکی سے، اور کن شعرا و ادبا کی عوام میں کیا مقبولیت تھی، ان کے اصل مقام کو قارئین کے سامنے بے لاگ انداز میں پیش کر دیے تھے اور پھر ندا فاضلی اس طویل انتظار سے اوب کر سگریٹ سلگا لیتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں:

''ساحر پیچھے آ رہے ہوں گے، اعجاز صدیقی، مہندر ناتھ کے ساتھ کیفی اعظمی کے گھر گئے ہوں گے اور اب تک وہاں سے روانہ ہو چکے ہوں گے، خواجہ احمد عباس مصروف تھے؛ مگر ۹ بجے تک مالیگاؤں پہنچ جانے کا وعدہ کر چکے تھے، وہ بھی اب تک گھر چھوڑ چکے ہوں گے، اعجاز صدیقی کتنے سیدھے، سچے اور نرم سبھاؤ کے آدمی ہیں، مجھے ان سے مل کر اکثر اپنے اندر کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور محسوس ہوئی ہے، تعجب تو اس بات پر ہے کہ بمبئی ایسی تجارتی بستی میں وہ اپنی مشرقی ملائمت کے ساتھ کیسے رہے ہیں؛ لیکن یہ بھی ان کی انفرادی پہچان تھی، جس سے سب پیار کرتے ہیں۔۔۔۔ اگت پوری تک دھوپ موٹر کی چھت سے اتر کر پہیوں کے نیچے آ چکی تھی، سردار اپنے مخصوص برانڈ کی سولہویں سگریٹ سلگا رہے تھے، سگریٹ سلگاتے وقت جعفری کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آتی ہے، جو اکثر پہلے کش کے ساتھ ہی جاتی ہے، اس لمحے جعفری صاحب کا ہاتھ بے دھیانی میں اپنے بالوں کی طرف اٹھ جاتا ہے، میرا جی چاہتا ہے، اس بے نام لڑکی کا نام پوچھوں، جو لگ بھگ تیس سال پہلے لکھنؤ جیل میں ان سے مجاز اور سبط حسن کے ساتھ ملنے آتی تھی، جس کی آنکھیں سوجی ہوتی تھیں، مجھے بہت ساری آنکھیں یاد آ جاتی ہیں، روتی ہوئی آنکھیں، سوجی ہوئی آنکھیں، رات رات بھر جاگتی ہوئی آنکھیں! اپنی ماں کی آنکھیں جو مجھے چھوڑ کر سمندر پار جا رہی تھیں۔

یادِ ماضی ہے عذاب ہے یارب!
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا ''

(ایضاً۔۔۔ص۔50)

موٹر اسٹارٹ ہو چکی تھی، سردار جعفری، اختر الایمان پچھلی سیٹ پر بیٹھے مونگ پھلی کے دانوں اگت پوری سے مالیگاؤں کا فاصلہ ناپنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن پانچ چھ میل کے بعد ہی وہ اس تجربے سے اوب گئے، پھر نئی شاعری موضوع بحث ہو گئی، باقر مہدی، وحید اختر، ندا فاضلی، شہر یار، قاضی سلیم نئے شاعر کچھ کہنا ضرور چاہتے ہیں نیا پن زبان میں، موضوع میں ATTITUDE میں، تینوں ہی ضروری ہے، اس کسوٹی پر کتنے پورے اترتے ہیں؟ نئی نظم پڑھنے کے بعد یاد نہیں رہتی، بقول ندا فاضلی:

''ہوا میں خنکی گھلتی جا رہی تھی، ڈھلتی دھوپ میں پیڑ کتنے اکیلے اکیلے نظر آتے ہیں، جیسے گاؤں کے بوڑھے جو گھنٹوں دہلیز پر بیٹھ آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے رہتے ......''۔

(ایضاً۔۔۔ص۔50)

موٹر کی رفتار کافی تیز تھی، گھنے درختوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے سفید دھبے پھیلتے جا رہے تھے، جیسے پیڑوں کی گھنیری ڈالیوں میں کسی نے آگرہ اسٹیشن پر بکتے ہوئے بہت سے چھوٹے چھوٹے تاج محل لا کر لٹکا دیے ہوں، مہاراشٹر کے مضبوط بازوؤں میں کسی بچے کی طرح ہمکتا ہوا شہر مالیگاؤں، زینے سے اترتی ہوئی کسی دوشیزہ کی طرح دھیمے دھیمے قریب آتا جا رہا تھا، مسجدوں کے مینار بلند ہوتے جا رہے تھے، ان گنت محنتی انگلیوں سے پھوٹتی ہوئی کرگھوں کی خوب صورت راگنی فضاؤں میں ہر طرف بکھرتی جا رہی تھی، مالیگاؤں ایک چھوٹی سی صنعتی بستی ہونے کے ساتھ، زبان وادب کا اہم مرکز بھی ہے، ''جشن شاعر'' کا شان دار پروگرام بھی اہل مالیگاؤں کی اردو دوستی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ یہ فنکشن ''بزم اعجاز'' کے تحت منعقد کیا گیا تھا، جس کا مقصد ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی کی مالی اعانت تھا۔

اب اس مشاعرے کی روداد ندا فاضلی اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں:

''دسمبر کی گلابی شام اپنی ریشمی انگلیوں سے ہواؤں کے

تاروں کو چھو رہی تھی، دن بھر کر گہوں سے جھوجھتے ہوئے ہاتھ مسجدوں کے بلند میناروں کے اوپر نیلے آسمان میں ٹنگے چاند کو روشن کر رہے تھے، لوک مانیہ ہائی اسکول مالیگاؤں کے کشادہ میدان میں دور دور تک آنکھیں ہی آنکھیں چمک رہی تھیں، ہم جب کسی کے منتظر ہوتے ہیں تو سر سے پاؤں تک آنکھ بن جاتے ہیں، بے شمار آنکھیں ایک نگاہ سے اسٹیج کو گھور رہی تھیں۔

سیٹھ شکیل احمد کی مختصر تقریر کے بعد خواجہ احمد عباس اپنے مخصوص انداز میں کل ہند مشاعرہ (جشن شاعر) کا افتتاح کر رہے ہیں، خواجہ احمد کی آواز تیکھی، تیز اور پھیلی ہوئی ہے، ان کے جملے کبھی ننگے سر نہیں ہوتے، ان کے سروں پر ہمیشہ ٹوپیاں چڑھی ہوتیں، مگر ان کا انداز لکھنؤ کے بانکوں کی طرح کچھ ترچھا ہوتا ہے، جس میں طنز بھی ہوتا ہے، شوخی بھی اور شگفتگی بھی، آج وہ ماہنامہ ''شاعر'' کی ادبی و تاریخی اہمیت اور اعجاز صدیقی کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈال رہے ہیں، بات سے بات نکالنا اور بہت ساری باتوں کو سمیٹ کر کہنا خواجہ صاحب کا اپنا طرز خاص ہے''۔(ایضاً۔۔۔ص۔52)

اسٹیج پر سردار جعفری، اختر الایمان، نظر مالیگانوی، اعجاز صدیقی، زبیر رضوی، عارف عباسی، نگار سلطانہ، صہبا حیدر آبادی، ہلال سیوہاروی، ممتاز راشد، رئیس رام پوری اور بہت سے دوسرے مقامی شعرا کا اجتماع ہے، دہلی کے مشہور جدید شاعر زبیر رضوی اس مشاعرے کی نظامت کر رہے ہیں۔ بقول ندا فاضلی:

''زبیر رضوی میرے پاس ہی مائک پر بیٹھے شاعروں کا تعارف دیتے جا رہے ہیں، میں سوچتا ہوں زبیر کو آئینہ دیکھنے کا بہت شوق ہوگا، یہ بھی ممکن ہے زبیر کی شاعری کی محبوبہ ان کی اپنی ہی ذات ہو، جس کی جھلک ان کے بولنے کے انداز اور شعر پڑھنے کے ڈھنگ دونوں سے نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ دوسرے نئے شاعروں کے برخلاف زبیر بہت کم اپنے آرٹ میں اکیلے نظر آتے ہیں''۔(ایضاً۔۔۔ص۔52)

مشاعرہ دھیرے دھیرے رنگ پر آتا جا رہا ہے، عتیق احمد عتیق، ممتاز راشد اور مقامی و بیرونی شعرا اپنا کلام سنا چکے ہیں، کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہزاروں سامعین بڑھتی ہوئی سردی میں مالیگاؤں کی ادب نوازی کا یقین دلا رہے ہیں۔ بقول ندا فاضلی:

''ہلال سیوہاروی بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنی کوئی نظم پڑھ رہے ہیں، ہلال کسی ایک شاعر کا نام نہیں؛ بلکہ آزادی کے بعد ہندوستان میں ایک خاص قسم کے شاعروں کی ایک پوری قوم کا نام ہے، بڑا چھوٹا کیسا ہی شاعر ہو، ایک دو ہلال ضرور نظر آجاتے ہیں، کہا جاتا ہے کسی زمانے میں مشاعرے شاعر کے فن کا امتحان سمجھے جاتے تھے۔

ابھی وہ نظم کے دو بند ہی سنا پائے تھے کہ اسٹیج کے پچھلے دروازے سے کرشن چندر، ساحر لدھیانوی اور مہندر ناتھ آتے دکھائی دیتے ہیں، نشستوں کی ذرا سی رڈو بدل سے ذرا ہی دیر کے لیے سامعین کی توجہ ہٹ جاتی ہے، ہلال سیوہاروی ناراض ہو جاتے ہیں اور دوبارہ مائک پر کھڑے ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے''۔(ایضاً۔۔۔ص۔52)

اس کے بعد بقول ندا فاضلی:

''کیفی اعظمی مشاعروں میں ٹرمپ کارڈ کی طرح استعمال کیے جاتے ہیں، سیدھا ترشا ہوا انداز بیان، موضوعات کی تجزیاتی گرفت، آواز کا ڈرامائی اتار چڑھاؤ اور بارعب شخصیت، دیکھتے دیکھتے مشاعرہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے، کیفی کے لہجے میں انیس کے سے تیور اور ظفر علی خان (ایڈیٹر زمیندار) کا سا سماجی شعور اپنی انفرادی شان کے ساتھ ابھرتا ہے''۔(ایضاً۔۔۔ص۔52)

اس کے بعد بقول ندا فاضلی:

''مشاعرہ کافی متوازن اور سنجیدہ ہو گیا ہے، زبیر رضوی نئی و پرانی شاعری کے بنیادی فرق کی وضاحت کرتے ہوئے میرا نام لے رہے ہیں، میں نظمیں سنا کر بیٹھا ہوں''۔

(ایضاً۔۔۔ص۔52)

یہاں ندا فاضلی نے اپنی نظم پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، نہ سامعین کے تاثرات کا کوئی ذکر کیا، فوراً زبیر رضوی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''زبیر رضوی اپنے مخصوص ترنم میں غزل چھیڑ رہے ہیں، شعر پڑھتے وقت زبیر کا پورا جسم گنگناتا ہوا لگتا ہے، زبیر کے اشعار صرف سنے ہی نہیں جاتے؛ بلکہ دیکھے بھی جاتے ہیں''۔

(ایضاً۔۔۔ص۔52)

آگے ندا فاضلی کہتے ہیں:

''جنگ اور محبت اچھے اچھے ذہنوں کو رومانی جذباتیت کا شکار

بنا دیتی ہے، مجھے مشہور ہندی ادیب ہری شنکر پرسائی کا جملہ یاد آرہا ہے: ''ہمیں دوسری سائنسی اسکیموں کی طرح جنگ پر ادب تخلیق کرنے کے لیے بھی یورپ سے گائڈ بیٹم بلانی چاہیے''۔(ایضاً۔۔ص۔52)

بقول فاضلی:

''ہند وچین اور ہند وپاک جنگ کے دوران ہمارے بیشتر شعرا لمبے لمبے کاغذوں پر خوں خوار جانوروں کی تصویریں بھی پینٹ کرتے رہے، ایسے میں سردار جعفری کی جنگ ومحبت کے موضوع پر مشہور نظم ''صبح فردا'' جانوروں کے شوروغل میں ایک زندہ اور تہذیب یافتہ انسان کی روشن آواز ہے''۔

(ایضاً۔۔ص۔52)

سردار جعفری کے بعد اعجاز صدیقی پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں، بقول فاضلی:

''اعجاز صدیقی نے نظریاتی لکیروں کو پیٹنے کے بجائے اپنے انفرادی دکھ کے آئینے میں سماج کے خدوخال دیکھنے کی کوشش کی ہے، ان کی آواز میں آنچ بھی ہے اور ٹھنڈک بھی، اس میں جیون کا دور تک ساتھ دینے کی شکتی ہے''۔

(ایضاً۔۔ص۔53)

آگے ندا فاضلی بیان کرتے ہیں کہ ابھی اعجاز صدیقی مائک سے لوٹے ہی ہیں کہ تین ہاتھوں سے گزرتا ہوا ایک پرچہ مجھ تک آیا، جس میں خواجہ احمد عباس نے کرشن چندر کا لکھ کر بھیجا ہے، کرشن جی کی زبانی کہانی کہنے سننے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا اور شاید مشاعروں کی روایات میں بھی اس قسم کا تجربہ نیا ہوا، بقول ندا فاضلی:

''کرشن جی کی کہانی دہلی اور وزیر: ایک تیکھا طنزیہ ہے، کرشن جی کی زبان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے، اگر مشاعرہ لوٹنا صحیح اصطلاح ہے تو کرشن جی آج کے مشاعرے کے سب سے بڑے ڈاکو کہے جا سکتے ہیں''۔(ایضاً۔۔ص۔53)

اور پھر اختر الایمان صاحب کی باری آتی ہے تو ندا فاضلی کہتے ہیں کہ:

''اختر الایمان مشاعروں میں ہمیشہ شاد عظیم آبادی کے مصرع ''میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں'' کی تفسیر نظر آتے ہیں، شعروں کی داد بھی کچھ اس طرح دیتے ہیں جیسے ڈر رہے ہوں کہ یہ جرم کرتے کوئی انھیں دیکھ نہ لے، اختر الایمان نے اپنی شاعری کے ذریعہ فرد اور سماج کے زندہ رشتے کی کھوج کی ہے، وہ دور سے پہچان میں آنے والے انے گنے اردو شاعروں میں سے ایک ہیں، ان کی شاعری کئی تہیں لیے ہوتی ہے، یہ سننے کے بہ نسبت پڑھنے میں زیادہ کھل کھیلتی ہے''۔(ایضاً۔۔ص۔53)

اختر الایمان کے بعد ساحر لدھیانوی کی باری آتی ہے، تو زبیر رضوی ایک لمبے چوڑے تعارف کے ساتھ ساحر لدھیانوی کا نام پکار رہے ہیں، رات کا ڈیڑھ بج چکا ہے، سردی اوس بن کر ٹپکنے لگی ہے؛ مگر ساحر کو سننے کے لیے پبلک سراپا اشتیاق ہے، ساحر کی نئی نظم بھی ان کے آنے سے بہت پہلے مشاعرہ میں پہنچ چکی ہوتی ہے، بقول ندا فاضلی:

''فرمائش پر فرمائش، ساحر کے پڑھنے کا انداز نہایت سلجھا ہوا، سادہ اور دھیما ہے، جس میں پنجابی لہجہ ایک حسن پیدا کردیتا ہے''۔(ایضاً۔۔ص۔53)

آخر میں ندا فاضلی کہتے ہیں کہ:

''دن بھر سفر کی تھکن اور دو بجے رات تک جگا کہ اپنی آواز بھی کسی دوسرے کے منھ سے نکلتی محسوس ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔کسی شہر سے رخصت ہوتے وقت میں اکثر شاعر بن جاتا ہوں، ایک ایک چیز میرا نام لیتی ہوئی نظر آتی ہے، چھوٹی بستیوں میں ہم بہت ساری چیزوں کو اتنے قریب سے دیکھتے ہیں کہ ایک دو دن کے قیام میں ہی وہ ہماری رازدار بن جاتی ہیں، راستوں کے درخت، گلیوں میں کھیلتے بے فکر بچے، ''بزم اعجاز'' کے پُرخلوص اراکین، نئے نئے دوستوں کے چہرے۔۔۔۔۔۔اور لپٹتے ہوئے بستر بند۔

دو آنکھیں اور لاکھوں جلوے من کو چین کہاں
ایک نظر سے باندھ لوں سب کو ایسے نین کہاں،،

(ایضاً۔۔ص۔53)

اس طرح ندا فاضلی نے ''جشن شاعر'' کا آنکھوں دیکھا حال اپنے تیکھے بے لاگ تبصروں کے ساتھ بیان کردیا ہے، جس میں طنز کی چاشنی نے اسے سہ آتشہ بنادیا ہے، کل پانچ صفحات پر مشتمل یہ رپورتاژ مختصر ہوتے ہوئے مکمل اور پُرکشش ہے۔

Nusrat Jahan
Research Scholar
University of Allahabad
Prayagraj-211002(U.P)

شاعرات کے منتخب اشعار

مفلس کا جس طرح سے جلے شام کو چراغ
دل بس اسی طرح سے ہمارا جلا کیا

اکثر اسی خیال سے راحت ملی مجھے
اپنا نہیں ہے پر وہ سلامت کہیں تو ہے

فاطمہ وصیہ جائسی

روز خوشبو کے مقدر میں رہی خود سوزی
اپنی ہی آگ میں جلتے رہے صندل کتنے

بارشیں ہوتی ہیں جس وقت بھری آنکھوں کی
راکھ ہو جاتے ہیں جلتے ہوئے آنچل کتنے

رفیعہ شبنم عابدی

حیراں ہوں تجھے دیکھ کے تو ہے کہ میں ہوں
یہ کس نے مرے ہاتھ میں آئینہ دیا ہے

جس شخص کو دیکھو تو یہ لگتا ہے کہ جیسے
اوراق پریشاں کی طرح بکھرا ہوا ہے

حسنیٰ سرور

تھکن سے چور ہوں لیکن رواں دواں ہوں میں
نئی سحر کے چراغوں کا کارواں ہوں میں

عجیب لوگ ہیں کاغذ کی کشتیاں گھڑ کے
سمندروں کی بلا خیزیوں پہ ہنستے ہیں

وفا لکھنوی

سراغ نقش قدم مٹ گئے تو کیا غم ہے
کہ منزلوں کے تعاقب میں رہ گزار تو ہے

ہاتھ لگاؤ تو انگارے دیکھو تو ہیں پھول
من کو دکھائے آس کا درپن کیسے کیسے رنگ

عرفانہ عزیز

کبھی کبھی تری چاہت پہ یہ گماں گزرا
کہ جیسے سر سے ستاروں کا سائباں گزرا

چراغ ایسے جلا کر بجھا گیا کوئی
تمام دید کا عالم دھواں دھواں گزرا

سیدہ شان معراج

حسب نسب کسے کہتے ہیں ہے سیادت کیا
زمانہ زر کا ہے اس دور میں شرافت کیا

دیارِ غیر میں کیا پوچھتے ہو نام و نشاں
غریب شہر ہوں میں کیا مری نجابت کیا

ناہید اختر

ان کے دل پر مرا احساس ستم بھی ہے گراں
غیر کی شعلہ بیانی کا گلا کچھ بھی نہیں

جام جم ہو کہیں گردش میں مگر پھر بھی حیات
چشم ساقی سے نہ چھلکے تو مزا کچھ بھی نہیں

مسعودہ حیات

ڈاکٹر رینو بہل

جنت ارضی

میتھیو کی جب آنکھ کھلی تو خود کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ قریب ہی کرسی پر بیٹھے بزرگ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ مسکراتے ہوئے اُس نے کہا:

''ویل کم بیک مائی سن''

میتھیو نے حیرت سے اُس اجنبی کو دیکھا جو اُسے مائی سن کہہ رہا تھا۔ کچھ کہنے کو لب ہلے مگر آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ بزرگ نے پاس سے گزرتی ہوئی نرس سے ڈاکٹر کو اطلاع دینے کو کہا اور شفقت بھری نظروں سے اُسے نہارنے لگا۔

میتھیو کے لیے یہ جگہ انجان تھی، نا آشنا چہرے بلکہ دیارِ غیر کے باشندے معلوم ہوتے تھے۔ اُن کا تلفظ بھی مختلف تھا۔ اُس نے آنکھیں موند لیں اور ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کی تو خوفناک سمندری طوفان کی زد میں آئے لوگوں کی چیخ و پکار کانوں میں گونجنے لگی۔ گھبرا کر اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

ڈاکٹر اُس کا معائنہ کر رہا تھا۔ اُس نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں ڈاکٹر نے سوالات کی بوچھار کر دی۔ وہ خالی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلا۔

''صدمے میں لگتا ہے بے چارہ۔'' بزرگ نے ڈاکٹر سے کہا۔

پاس کھڑی نرس کو تاکید کر کے ڈاکٹر وارڈ سے باہر چلا گیا۔

بزرگ نے کرسی اُس کے بستر کے اور قریب کر کے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''میرا نام تھومس ہے۔ پندرہ روز پہلے تمھیں سمندر کے کنارے نیم جان حالت میں پایا گیا تھا۔ اسے کرشمہ ہی سمجھو کہ تم زندہ ہو۔ سمندر تمھیں نگلنا نہیں چاہتا تھا شاید اسی لیے لہروں نے تمھیں اپنے دامن سے جھٹک کر باہر ریتیلی زمین پر پٹخ دیا۔''

میتھیو خالی ویران آنکھوں سے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ تھومس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟ سمندری سانپ، مگرمچھ، شارک جیسے خطرناک سمندری جانور تمھیں اپنا لقمہ نہیں بنا سکے ورنہ سمندر جب غصے میں آجائے تو کسی کو نہیں بخشتا۔ یہ کسی کا دوست نہیں۔''

میتھیو نے ایک سرد آہ بھری اور پھر سے آنکھیں موند لیں۔ شاید کمزوری کی وجہ سے کچھ اور سننے اور دیکھنے کی سکت اُس میں نہیں تھی۔

''میں تمھیں یہاں لایا تھا لہٰذا تم میری ذمہ داری ہو۔ صحیح سلامت تمھیں واپس بھیجنا میرا فرض ہے۔ تم اب آرام کرو میں کل شام کو پھر آؤں گا۔''

اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ تھومس نے نرس کو کچھ کہا پھر خراماں خراماں چلتے وارڈ سے باہر نکل گیا۔ اُس نے اپنے اردگرد کے ماحول کا

جائزہ لیا۔ وارڈ میں تین اور مریض تھے۔ کھڑکی کے باہر گہرا نیلا آسمان اور پھولوں سے لدے درخت نظر آ رہے تھے۔ نہ جانے وہ کون سی جگہ آ پہنچا ہے۔ ایک بار پھر ذہن پر زور دینا چاہا مگر سمندر میں اُٹھتے طوفان کے علاوہ وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا اور اُسے محسوس ہوا وہ سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ اس پر غنودگی چھا گئی اور بوجھل پلکیں بجھ گئیں۔

دائیں ٹانگ میں درد کی شدت کی وجہ سے اُس کی نیند کھلی۔ صبح کی روشنی چھن سے کھڑکی سے آ رہی تھی۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو بیٹھ نہ سکا۔ اُسے جدوجہد کرتے دیکھ نرس اُس کی مدد کے لیے آ گئی۔ اُس نے درد کی شکایت کی تو نرس نے بتایا:

''آپ کی ٹانگ کا آپریشن ہوا ہے درد تو ہوگا۔'' ڈرپ میں انجکشن بھرتے اُس نے بتایا:

''کسی سمندری جانور نے ٹانگ کا ماس نوچ لیا تھا۔ بائیں ران سے جلد لے کر زخم پر گرافٹنگ کی ہے اس لیے تکلیف ہو رہی ہے۔ درد کا انجکشن بھر دیا ہے ابھی آرام آ جائے گا۔''

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''نخلستان''

''نخلستان؟ یہ کہاں ہے؟''

''دنیا کی نظروں سے اوجھل چھوٹا سا جزیرہ ہے'' اُس نے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا اور دوسرے مریضوں کو دیکھنے چلی گئی۔

شام کو تھومس کو آتا دیکھ کر میتھیو کا چہرہ ایسے کھل اُٹھا جیسے کوئی اپنا قریبی آیا ہو۔

''پہلے سے بہتر لگ رہے ہو ینگ مین''

''میتھیو'' اُس نے ہاتھ تھومس کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنا نام بتایا۔

''خوشی ہوئی تمھیں بات کرتے دیکھ کر۔''

وہ مسکرا دیا۔

بستر کے قریب کُرسی پر بیٹھتے تھومس گویا ہوا:

''تم یہ بتاؤ میتھیو تم اس طرف کیسے آ پہنچے؟ کہاں کے ہو؟''

''ہندوستان کے چھوٹے سے گاؤں کا باشندہ ہوں۔ میرا گاؤں سمندر کنارے آباد ہے۔ گھر سے ناراض ہو کر نکلا تھا۔ دوست سے موٹر بوٹ لی اور سمندر میں نکل گیا۔ لہرے اُچھل اُچھل کر آ رہی تھیں اور اُن لہروں سے جوجھتے میرے اندر کی تکلیف کو تسکین مل رہی تھی۔ چلتے چلتے میں بہت دور نکل آیا۔ نہ وقت کا احساس رہا نہ فاصلے کا۔ رات کے سائے بڑھنے لگے اور آسمان پر چمکتا پورا چاند اپنی روشنی اور ٹھنڈک سے میرے وجود کو پُرسکون کرنے لگا۔ پھر نہ جانے کدھر سے کالے بادل گھر کر آئے اور چاند کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ چاند کے چھپتے ہی اندھیرا پھیل گیا، تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ لہروں کی رفتار بڑھ گئی۔ میں نے موٹر بوٹ کا رُخ واپسی کے لیے موڑا ہی تھا کہ طوفان نے دستک دے دی۔ ہوا کی رفتار بہت تیز تھی اور لہروں کا اُچھال کم سے کم سو میٹر تک پہنچ گیا۔ میری بوٹ ڈگمگانے لگی۔ میں اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ سامنے سے میں نے بڑے جہاز کو آتے دیکھا تو اُمید کی کرن نظر آئی مگر لوگوں کی دردناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔ جہاز سے لوگ جان بچانے کے لیے سمندر میں کود رہے تھے شاید جہاز بھی ڈوبنے کی کگار پر تھا پھر میری بوٹ کی کیا حیثیت تھی۔ تیز لہر آئی اور میں سمندر میں تھا۔ خود کو بچانے کی جدوجہد کرتا رہا۔ لکڑی کا ایک ٹکڑا مجھ سے ٹکرا گیا جسے میں نے کس کر پکڑ لیا اُس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اب میں کبھی اپنے بچوں، اپنی ماں اور بیوی سے نہ مل پاؤں گا۔ یہ رات میری آخری رات ہے۔'' خوف اور درد کے نقوش اُس کی آنکھوں اور اُس کی آواز میں نمایاں تھے۔

''افسوس ہوا سن کر مگر خوشی اس بات کی ہے کہ تم ایسے طوفان سے بچ گئے۔'' میتھیو کے کاندھے کو شفقت سے تھپتھپاتے ہوئے تھومس نے کہا۔

''گاڈ از گریٹ''

''تمھیں معلوم نہیں ہوگا کہ ہمارے جزیرے میں باہر کا کوئی باشندہ نہیں آ سکتا۔ ہاں اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو اُسے تب تک یہاں پناہ ملتی ہے جب تک وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر واپس جانے کے قابل نہیں ہو جاتا۔ تمھارے زخم بھر جائیں گے تو تمھیں بھی واپس بھیج دیا جائے گا۔ تمھارے پریوار پر نہ جانے کیا گزر رہی ہوگی۔''

''میری بوڑھی ماں تو یہ صدمہ نہ جانے کیسے برداشت کرے گی۔ میری بیٹی تب تک کھانا نہیں کھاتی جب تک میں گھر نہ پہنچ جاؤں۔ نہ جانے گریس اور ذین کا کیا حال ہوگا؟'' اُن کا خیال آتے ہی اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

''ہمت سے کام لینا ہوگا تمھیں ابھی ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔'' اُس نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

ملنے کا وقت ختم ہوا تو تھومس کل دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

وارڈ میں موجود باقی تین مریضوں سے بھی اُس کی بات چیت شروع ہو گئی

تھی۔ وہ تینوں یہاں کے مکین تھے۔ اُن میں سے جو بھی آتا، اُس کے پاس آ کر اُس کا حال بھی دریافت کرتا۔ یہاں کے لوگوں کی خوش اخلاقی نے اُسے بہت متاثر کیا تھا۔ بیماری اور تکلیف کے باوجود اُن کے چہروں پر مسکان رقصاں رہتی۔ لوگوں کے چہروں سے سادگی، پاکیزگی، شادابی اور سکون کی جھلک نظر آتی تھی۔

تھومس نے جانے سے پہلے ڈیوٹی نرس کو اُس کا خاص خیال رکھنے کی گزارش کی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نرس میتھیو کے پاس آ کر اُس کو دیکھ بھی جاتی اور بات بھی کر جاتی۔ ڈیوٹی ختم ہونے سے پہلے وہ میتھیو کے پاس آئی اور میتھیو کی ڈرپ اُتارتے ہوئے اُس نے پوچھا:

''میتھیو اگر تمھارا کچھ خاص کھانے کو دل کرے تو بتا دینا۔''

''جی شکریہ''

''میرا نام فلورا ہے۔ میں نے سسٹر ایڈلی کو کہہ دیا ہے تمھارا خیال رکھنے کو۔ کوئی پریشانی ہو تو اُنھیں بتا دینا''

''آپ سب کا ایسے ہی خیال رکھتی ہیں؟''

''نہیں۔ تمھارا یہاں کوئی نہیں اس لیے سوچتی ہوں تم خود کو اکیلا مت سمجھو۔ صبح ملتے ہیں۔ شب بخیر۔''

اُس کی آواز میں اپنائیت اور خلوص کی چاشنی گھلی ہوئی تھی۔ فلورا کو جاتے دیکھتا رہا پھر کروٹ بدل کر آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ جیسے ہی وہ آنکھیں بند کرتا، طوفان کا خوفناک منظر اُس کی بند پلکوں میں پھر سے جی اُٹھتا وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا۔ اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بچ کیسے گیا۔ اس کے پیچھے بھی خدا کی کوئی مصلحت ہوگی۔ نہ جانے گھر پر کیا حال ہوگا۔ سب اُس کے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ نہ جانے اُس کی تلاش میں کہاں کہاں بھٹک رہے ہوں گے۔ شکیل نے اُنھیں بتا دیا ہوگا کہ وہ اُس کی بوٹ لے کر سمندر میں نکلا تھا۔ طوفان کی خبر سُن کر کہیں وہ اُسے مرا ہوا نہ سمجھ بیٹھیں۔ نورا اور ذین کے معصوم چہرے اُس کی نظروں میں گھوم گئے۔ ماں اور گریس کا خیال آتے ہی وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ رات کی خاموشی میں اُس کے اندر کا طوفان، درد بھری چیخیں اُسے بے چین کرنے لگیں۔ وارڈ میں اُس کا دم گھٹنے لگا۔ جی چاہا کہ کھلی ہوا میں جا کر سانس لے۔ اُس نے بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر ٹانگ کے درد نے اُسے زمین پر پاؤں رکھنے کی اجازت نہ دی۔ بے بسی کے عالم میں خود کو حالات کے حوالے کر دیا۔ نڈھال بستر پر پڑا صبح کا انتظار کرتا رہا۔

صبح فلورا جب ڈیوٹی پر آئی تو اپنی خواہش ظاہر کرتے ہوئے پوچھا:

''کیا یہ ممکن ہے کہ کچھ دیر کے لیے مجھے کھلی ہوا میں لے چلو۔ میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔''

''میں دیکھتی ہوں'' اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

قریب ایک گھنٹے بعد وہ میتھیو کو وہیل چیئر پر بٹھا کر ہسپتال کے باغ میں لے آئی۔ اپنے چاروں طرف رنگ برنگے پھولوں سے لدے درخت اور کیاریاں، سر پر نیلا آسمان اور دُور امبر کو چومتی پہاڑوں کی چوٹیاں۔ خوبصورت منظر دیکھ کر اُس کی طبیعت شاداب ہوگئی۔ فلورا بھی اُس کے قریب بنچ پر بیٹھ گئی۔ ہلکی سردی میں جسم کو چھوتی دھوپ سکون بخش رہی تھی۔ اس انجان پُراسرار جزیرے کے بارے میں جاننے کی خواہش فلورا نے پوری کر دی۔

''یہاں کی آبادی زیادہ نہیں ہے۔ لوگ محنت کش ہیں اور خوش حال زندگی بسر کرتے ہیں۔ کوئی کسی کا حق نہیں مارتا نہ کسی سے بے ایمانی کرتا ہے اور نہ ہی زیادتی۔ عورتوں کو عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ تعلیم سب کے لیے لازمی بھی ہے اور مفت بھی۔ یہاں سب برابر ہیں نہ کوئی غریب نہ امیر، نہ کالے گورے میں فرق ہے نہ کوئی ذات پات۔ یہاں سب کا مذہب انسانیت ہے۔ ہمارے حکمران خود کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے جیتے ہیں۔ ہر کسی کے سر پر چھت ہو اور سب کو روزی روٹی مہیا کرنا وہ اپنا اوّل فرض سمجھتے ہیں اور خود کو لوگوں کا خادم کہتے ہیں۔ ہماری پولیس کا کام صرف باہر کے لوگوں کو یہاں آنے سے روکنا ہے اور جو مجبوری میں یہاں رُکے ہیں ان پر اُن کی کڑی نظر رہتی ہے۔''

''یعنی مجھ پر بھی نظر رکھی جا رہی ہے۔'' میتھیو نے ہنس کر پوچھا۔

''بالکل۔ تم تب تک یہاں ہو جب تک تم پوری طرح تندرست نہیں ہو جاتے۔ ٹھیک ہوتے ہی تمھیں یہاں سے نکل جانا ہوگا۔''

اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تم کچھ اپنے ملک کے بارے میں بتاؤ'' فلورا نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بتاؤں تمھیں۔ تم نے جو کچھ بھی کہا اُس کے برعکس ہے سب کچھ۔''

''مطلب؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ بھوک، افلاس، غربت، جہالت ہے''

''بس بس رہنے دو۔'' فلورا نے پریشان ہو کر بنچ سے اٹھتے ہوئے کہا:

''کیا ہوا؟''

''اس سے زیادہ سننے کی میری قوت نہیں تم لوگ سانس کیسے لیتے

ہوا یسے ماحول میں؟'' اُس نے کسیلے لہجے میں پوچھا۔

''مجبوری ہے۔'' میتھیو نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''اب ہمیں اندر چلنا چاہیے۔ کافی دیر ہوگئی۔ دوسرے مریضوں کو بھی دیکھنا ہے۔''

''کل دوبارہ لاؤں گی باہر؟''

''جتنے دن تم یہاں ہو روز لاؤں گی۔'' میتھیو کی وہیل چیئر ہسپتال کے اندر لے جاتے ہوئے اُس نے وعدہ کیا۔

فلورا نے جو اُس سے وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا۔ ہر روز تقریباً ایک گھنٹے کے لیے وہ اُسے ہواخوری کی غرض سے باہر لے آتی اور شام کو دو گھنٹے اُس کے تھومس کے ساتھ گزر جاتے۔ دونوں کے ساتھ ملاقات کا اُسے انتظار رہتا۔ اُس کی طبیعت دھیرے دھیرے بہتر ہو رہی تھی۔ پہلے ویل چیئر پھر واکر اور اب اسٹک کے سہارے میتھیو چلنے لگا تھا۔ فلورا نے اُسے خوش خبری سناتے ہوئے کہا:

''شاید تمھیں ایک دو دن میں چھٹی مل جائے اور جیسے ہی تم بنا سہارے کے چلنے لگو گے تمھیں واپس بھیجنے کا انتظام ہو جائے گا۔''

اسپتال سے چھٹی کے بعد تھومس اُسے سیدھے اپنے گھر لے گیا حالانکہ فلورا نے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ کچھ دن اُس کا مہمان بن کر رہے۔ تھومس نے یقین دلاتے ہوئے کہا تھا:

''تم جب چاہو اس سے ملنے آ سکتی ہو۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھنا۔ جانے سے پہلے وہ تمھارا مہمان بھی ضرور بنے گا۔''

اسپتال سے نکل کر پہلی بار وہ جزیرے کی خوبصورتی کا نظارہ کر رہا تھا۔ کشمیر کو دھرتی پر جنت کہا گیا ہے مگر وہاں دہشتگردی، خون خرابا، فسادات نے اُسے جہنم بنا دیا ہے۔ یہ جزیرہ خوبصورتی، امن، سکون اور لوگوں کی تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے یقیناً جنت کے خطاب کا حقدار ہے۔ اس جنت کو چھوڑ کر اُس جہنم میں کون عقل مند جانا چاہے گا؟ اسے لاپتا ہوئے تقریباً تین ماہ ہو چکے تھے۔ اب تک تو اُسے مرا ہوا قرار دے دیا ہوگا۔ سب اُس کی موت پر صبر بھی کر چکے ہوں گے۔ سب سے زیادہ فکر اُسے ماں کی تھی۔ گریس تو کسی طرح دونوں بچوں کو سنبھال لے گی مگر ماں۔۔۔؟

ماں کی وجہ سے دونوں میں اُس روز جم کر جھگڑا ہوا تھا۔ دیدے پھاڑ کر ہاتھ نچاتے اونچی آواز میں جھگڑتے آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ بچے سہم کر دادی کے پاس دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔ اسے خاموش کرنے کے لیے پہلی بار اُس نے بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا اور پھر غصے میں گھر سے نکل آیا۔ دن رات ایک ہی راگ الاپتی رہتی کہ ''ماں کو اولڈ ایج ہوم چھوڑ آؤ۔'' روز روز کی گھر میں لڑائی ہوتا دیکھ کر ماں نے اُسے کہا تھا:

''بیٹا مجھے وہاں چھوڑ کیوں نہیں آتے کیوں میرے آخری دنوں کو بے سکون کر رہے ہو؟''

''میرے ہوتے آپ وہاں نہیں جائیں گی۔ آج آپ نے یہ بات کہہ دی آئندہ آپ سے ایسی بات نہیں سننا چاہوں گا۔'' ماں کے دونوں ہاتھ چومتے ہوئے اُس نے بوڑھی ماں کو پیار سے کہا تھا۔ وہ جانتا تھا اُس کی ماں نے کتنی محنت کر کے اُس کی پرورش کی ہے۔

تھومس کا چھوٹا سا گھر بڑی سادگی اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ وہ تنہا رہتا تھا۔ اُس کی شفقت اور خلوص میں اتنی اپنائیت تھی کہ میتھیو کو لگا ہی نہیں کہ وہ کسی نئی اجنبی جگہ پر رہ رہا ہے۔ دونوں کا ایک ساتھ وقت اچھا گزر رہا تھا۔ کبھی دونوں گھومنے نکل جاتے تو کبھی خوش گپیوں میں مشغول ہو جاتے۔ فلورا بھی ہر روز شام کو اسپتال کے بعد اُن کے پاس آ جاتی۔ تینوں ایک ساتھ کھانا کھاتے۔ کبھی رات کو گھر لوٹ جاتی تو کبھی وہیں رُک جاتی۔ تینوں کی زندگیاں کھلی کتاب کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تھیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ فاصلے مٹ رہے تھے۔ میتھیو کی طبیعت بھی تقریباً ٹھیک ہو چکی تھی۔ اب اُس نے بنا سہارے بنا اسٹک کے چلنا شروع کر دیا تھا۔ ڈیڑھ مہینے میں اُس کے آس پاس کے لوگوں سے بھی اچھی جان پہچان ہو گئی تھی۔ ماں اور بچوں سے بچھڑنے کے غم کے علاوہ اُسے کوئی غم نہ تھا۔ زندگی بڑی پُرسکون گزر رہی تھی۔

ایک روز رات کو کھانا کھاتے وقت فلورا نے بات شروع کی:

''اب تو تم بالکل ٹھیک ہو گئے ہو۔ اب انتظامیہ تمھیں جلد واپس بھیج دے گی۔'' اُس نے اُداس لہجے میں کہا۔

تھومس سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا یہ ممکن نہیں کہ تم ہمیشہ کے لیے میرے پاس رہ جاؤ؟''

''دل تو میرا بھی نہیں چاہتا آپ لوگوں کو چھوڑ کر جانے کو۔'' میتھیو نے فلورا کے چہرے پر کچھ تلاش کرتے ہوئے کہا۔

''فلورا تم کیا کہتی ہو؟'' تھومس نے پوچھا۔

''میں بھی یہی چاہتی ہوں مگر یہ فیصلہ سراسر میتھیو کا ہے۔''

''کون کمبخت یہ جنت اور ایسی حور کو چھوڑ کر جانا چاہے گا؟'' اُس نے شرارت سے فلورا کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

فلورا کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا اور تھومس مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

''تو پھر تم ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس رُک رہے ہو۔''

تھومس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''تھوڑا صبر کریں آپ میتھیو کو سوچنے کا موقع دیں۔ یہ فیصلہ اتنا آسان نہیں۔ ایک بار اگر وہ یہاں رُک گیا تو دوبارہ لوٹ کر اپنے گھر نہیں جا پائے گا۔ کیا وہ یہ قربانی دے سکتا ہے؟ یہ فیصلہ اسے سوچ سمجھ کر کرنے دو۔ اگر فیصلہ ''ہاں'' میں ہوا تو ہم جلد شادی کر لیں گے اور اگر ''ناں'' میں ہوا تو مجھے کوئی گِلہ کوئی شکایت نہ ہوگی۔''

دوسری صبح میتھیو خلافِ توقع دیر تک سوتا رہا جب روشن دان سے سورج کی کرنیں اُس کے چہرے پر پڑیں تو اُن کی تمازت سے اُسے دن چڑھنے کا احساس ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد آنکھیں کھول کر بستر کو خیر باد کہے مگر اُس کے دل، دماغ اور بدن پر چھائی کسلمندی نے بستر چھوڑنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا۔

چند لمحے پلنگ پر کروٹیں بدلنے اور لذتِ نشاط کے احساس میں ڈوبے رہنے کے بعد پہلے دھیمی پھر اونچی آواز میں میتھیو نے فلورا کو پکارنا شروع کر دیا۔

صحن میں موجود اہل خانہ کو میتھیو کے اس طرح زور، زور سے فلورا، فلورا پکارنے پر تشویش ہوئی تو دوڑی، دوڑی ایک خاتون کمرے میں داخل ہوئی اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اوپر نیچے ڈولتے الفاظ ہوا کے دوش پر لہرانے لگے۔

''کس کو بلا رہے ہو؟''

ایک دو مرتبہ ہونّقوں کی مانند میتھیو نے اپنے دائیں بائیں حیرت سے غور کیا۔ اُس کے بعد لمبی سانس لیتے ہوئے معنی خیز نظروں سے خاتون کی جانب دیکھا اور بانہیں پھیلاتے ہوئے گویا ہوا:

''جنتِ ارضی کو اور کسے!''

❑❑❑

Dr. Renu Behl
1505, Sector 49B
Chandigarh-160047 (Haryana)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

E-mail:magazines@ncpul.in, فیکس: 011-26108159, فون: 011-26109746

دستخط

احساس

رخسانہ نازنین

”بوا۔تمھاری مَت ماری گئی ہے جو میری پھول سی بیٹی کے لیے اس اپاہج کا رشتہ لے آئیں!اپنی بیٹی کو بھلے ہی کنویں میں دھکیل دوں لیکن اس اپاہج سے ہرگز نہ بیاہوں۔!!!“

سلمیٰ بیگم کے لہجے میں شدید حقارت تھی۔بوا اپنا سا منھ لے کر رہ گئیں۔

ساجد ایک متوسط گھرانے کا تعلیم یافتہ برسر روزگار نوجوان تھا۔بچپن میں پولیو کا شکار ہونے کے سبب ایک پیر مفلوج ہو چکا تھا۔لیکن اس نے اپنے عزم کے سہارے زندگی کی محرومی کا سامنا کیا اور ایک باوقار زندگی کے حصول میں کامیاب رہا۔برسر روزگار ہوا تو ہر ماں کی طرح حمیدہ بیگم کے دل میں بھی بیٹے کے سر پہ سہرا سجانے کا ارمان جاگا۔لیکن اس بے رحم معاشرے میں کوئی اتنا فراخ دل اور اعلیٰ ظرف نہ تھا کہ ”ایک معذور نوجوان سے اپنی بیٹی بیاہے!“

حمیدہ بیگم نے بوا کے توسط سے بے شمار دَر کھٹکھٹائے.....لیکن سب کا وہی ٹکا سا جواب.....!”نا بھئی نا! اس ساجد کی بات نہ کرو!“ جیسے وہ کوئی اچھوت تھا!

بوا حمیدہ بیگم کو اپنی ناکامیوں کی داستان سناتیں اور بارہا اپنے کمرے میں بیٹھے ساجد کے دل میں یہ باتیں تیر کی مانند گڑ جاتیں۔اپنی بے وقعتی اور ٹھکرائے جانے کا احساس اس کے دل کا ناسور بن گیا تھا۔

لوگوں کی ہمدردی بھری باتوں ، اور ترس کھاتی نگاہوں سے اسے نفرت تھی۔اپنی ذات سے چپکا ”بے چارہ“ لفظ اسے کسی گالی کی مانند لگتا۔!اس کی شخصیت مسخ ہونے لگتی۔اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا...۔بمشکل خود کو سنبھالتا۔زندگی میں صرف تنہائیاں تھیں اور محرومیوں کی اذیتیں....!

بے کیف شب و روز گزرتے جا رہے تھے۔اس شام حمیدہ بیگم سے ملنے ان کی پرانی اور عزیز دوست رقیہ بیگم آئی ہوئی تھیں۔عرصہ دراز بعد دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔دونوں ہی اپنے سکھ دکھ سنا رہی تھیں۔حمیدہ بیگم نے رندھے ہوئے لہجے میں ساجد کا رشتہ نہ طے ہونے کا ذکر کیا اور سبب بتایا تو رقیہ بیگم کے دل پر بھی رنج و ملال کے بادل چھا گئے۔ان کا حساس دل تڑپ اٹھا۔”کاش وہ اپنی دوست کا دکھ دور کر سکتیں، اور ان کی آرزوئیں پوری کر پاتیں.!“ ساجد آفس سے لوٹا تو اسے دیکھ کر انھیں خوشگوار حیرت ہوئی۔انھوں نے بچپن میں اسے دیکھا تھا۔اب وہ ایک خوبرو نوجوان کے روپ میں ان کے سامنے تھا۔وہ اس کے اخلاص اور شائستگی سے بھی بہت متاثر ہوئیں۔

گھر لوٹیں تو اپنی بیٹی عالیہ سے بھی اسی کا ذکر کرتی رہیں۔وہ بھی اس ان دیکھے ، انجانے شخص کا دکھ اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کرنے لگی۔کچھ برس قبل رقیہ بیگم نے بیوگی کی چادر اوڑھی تھی۔زندگی یکا یک

بے مہر ہوگئی تھی۔ آزمائشوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ اپنوں کی بے اعتنائیاں سہی تھیں اور رشتوں کے بدلتے روپ دیکھے تھے۔ عالیہ نے ان کٹھن حالات میں صبر کا دامن تھامے رکھا۔ اپنے عزم کے سہارے ایک باوقار مقام پر پہنچی۔ گھر میں ہی اس نے کوچنگ سنٹر کھول لیا تھا اور اب وہ ایک محنتی اور فرض شناس ٹیوٹر کے روپ میں جانی جاتی تھی۔

کچھ دنوں بعد حمیدہ بیگم ساجد کے ساتھ رقیہ بیگم کے گھر آئیں۔ عالیہ نے ساجد کو دیکھا۔ جھکی جھکی نظریں، پروقار سراپا، شائستہ گفتگو وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوگئی۔ ساجد بھی اس پرخلوص لڑکی میں انجانی سی کشش محسوس کر رہا تھا۔ احساس کا رشتہ خلوص کا پیراہن پہنے دلوں میں جاگزیں ہوا تو زندگی میں قوس وقزح کے رنگ بکھر گئے.!

ساجد کی سونی زندگی میں عالیہ بہار بن کر آئی اور اس کی ساری محرومیاں اور درد سمیٹ لیے۔ رقیہ بیگم نے بیٹی کی آنکھوں میں ساجد کے لیے چھلکتی محبت بھانپ لی۔ انھیں اپنی بیٹی کے انتخاب پر فخر محسوس ہوا کہ اس نے عام لڑکیوں کی طرح دولت اور وجاہت کو نہیں بلکہ کردار کی بلندی کو پرکھا، ایک ادھورے شخص کو چاہا اور اپنانے کی جرأت کی.!

جلد ہی ساجد اور عالیہ ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔ تنہائیاں گنگنانے لگیں، بہاریں سایہ فگن ہوگئیں۔ ذہنی اور دلی ہم آہنگی کے باعث زندگی اور بھی خوشگوار ہوگئی تھی۔

"اسد کو احساس کی دولت اپنے والدین سے بطور ورثہ ملی تھی۔ وہ ایک دردمند دل کا مالک تھا۔ شاہراہ حیات پر ایک دن اس کی ملاقات نوریہ سے ہوئی۔ حسن وسیرت کا مجسمہ لیکن دنیا کی رنگینیوں سے محروم! ایک حادثے میں اس نے اپنی بینائی کھو دی تھی۔ لیکن اس محرومی کے باوجود مایوس نہ تھی۔ بلکہ صبر وشکر سے زندگی کے محاذ پہ ڈٹی ہوئی تھی۔" اسکول آف بلائنڈ" میں اپنی خدمات انجام دے رہی تھی اور بے رنگ آنکھوں میں جینے کے خواب سجائے نابینا لڑکے لڑکیوں کو بنا کسی سہارے کے جینے کا درس دے رہی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اولاد کی انمول دولت سے نوازا۔ اسد اور جواد کی پیدائش کے بعد لوگوں کو ان کی زندگی پر رشک آنے لگا تھا۔

وقت کا طائر محو پرواز رہا۔ اسد اور جواد بڑی کامیابی سے تعلیمی مدارج طے کرتے رہے۔ اسد پیشہ طب سے منسلک ہوا اور جواد نے IPS کر کے ملک وقوم کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔

اسد کو احساس کی دولت اپنے والدین سے بطور ورثہ ملی تھی۔ وہ ایک دردمند دل کا مالک تھا۔ شاہراہ حیات پر ایک دن اس کی ملاقات نوریہ سے ہوئی۔ حسن وسیرت کا مجسمہ لیکن دنیا کی رنگینیوں سے محروم! ایک حادثے میں اس نے اپنی بینائی کھو دی تھی۔ لیکن اس محرومی کے باوجود مایوس نہ تھی۔ بلکہ صبر وشکر سے زندگی کے محاذ پہ ڈٹی ہوئی تھی۔ ''اسکول آف بلائنڈ'' میں اپنی خدمات انجام دے رہی تھی اور بے رنگ آنکھوں میں جینے کے خواب سجائے نابینا لڑکے لڑکیوں کو بنا کسی سہارے کے جینے کا درس دے رہی تھی۔

اسد کسی کام سے اس اسکول گیا۔ نوریہ کو دیکھا تو اس معصوم سی لڑکی کے آہنی حوصلے نے اسے حد درجہ متاثر کیا۔ وہ اس کا اسیر ہوتا چلا گیا....

احساس کا ایک اور خوبصورت رشتہ محبت میں بدل گیا اور اسد نے نوریہ کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔

ساجد اور عالیہ نے اس کے فیصلے کو بڑی خوشدلی سے قبول کیا ''بیٹے۔ مجھے تم پر فخر ہے کہ تم نے ظاہری نہیں بلکہ باطنی حسن کو ترجیح دی.! ایک وقت تھا جب اس بے رحم دنیا نے مجھے ٹھکرایا تھا۔ تب تمھاری ماں کے حساس دل نے مجھے چاہا اور اپنایا.! آج تم نے اسی حساس دل میں ایک اور محروم لڑکی کو بسایا ہے اور اسے اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے عالیہ پر فخر تھا آج اس کی تربیت پر ناز ہے!'' ساجد نے شفقت بھرے لہجے میں اسد کے فیصلے کو سراہا اور شادی کی رضامندی پر مہر ثبت کر دی۔ عالیہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ آج وہ سرخرو ہوگئی تھی۔

نوریہ کی تاریک زندگی میں خوشیوں کے چراغ جل اٹھے کہ احساس کی لَو اب بھی کچھ دلوں میں جگمگاتی ہے۔ جس کی آب وتاب سے ان کے وجود منور ہو جاتے ہیں!!!

□□□

Rukhsana Nazneen
H. No. 4-2-22
Noor Khan Taleem
Bedar-585401(Karnataka)

آزمائش شرط ہے....!!!

سیدہ ایمن عبدالستار

وہ جو ڈوبتے ہیں وہ پھر کہاں سے ابھرتے ہیں اس میں خود سے جنگ کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی لبوں پر نڈھال باتیں زخم خوردہ مسکراہٹیں آ کے تھم گئی تھی

وقت سبک خرام بھی ہے۔۔۔۔۔!!!

اور ستم گر بھی...!!!

وہ کسی کے لیے رکتا نہیں کسی کے لیے تھمتا نہیں کسی کا انتظار نہیں کرتا وقت کے سینے میں درد نہیں دل میں دھڑکن نہیں وقت کو زخم نہیں لگتے چوٹ نہیں لگتی گھائل نہیں ہوتا وقت زخموں کا مداوا تو بن سکتا ہے لیکن زخموں پر آنسوں نہیں بہاتا کسی کے درد کا ساجھی نہیں ہوتا وہ تو خرامہ خرامہ ہر جذبے کو نظر انداز کیے انجان بنا گزر جاتا ہے یا گزر چکا ہوتا ہے اور بندہ اس کی آنکھوں میں بس بے بسی سے دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ارحم نے گہری سانس لی وقت چپکے چپکے چند گھنٹے مزید اس کی زندگی سے چرا لے گیا تھا گہری شام رات کی تاریکی میں ڈھل چکی تھی وہ اٹھا اور کمرے کے پردے برابر کرتے کرتے اس کے ہاتھ تھم گئے۔

ابھی بھی منشی کے کوارٹر مینشن کے دائیں جانب بے رنگ حالت میں پڑا تھا جانے کس جذبے کے تحت وہ کمرے سے باہر نکلا شال کو اپنے شانوں پر کچھ سختی سے لپٹایا اور تیز تیز قدم رکھتا چند ہی لمحوں میں وہ کوارٹر کے دروازے پر تھا دستک کے جواب میں کسی بتیس سے کچھ کم عمر والے نوجوان نے دروازہ کھولا تو وہ ٹھٹھک گیا۔

”مالک...!! آپ یہاں اس وقت ...؟؟ کچھ چاہیے آپ کو ...؟؟“ وہ نوجوان حیران سا پوچھ رہا تھا اس نے نفی میں سر ہلایا اور تیزی سے واپس پلٹ کر پچھلے لان میں ٹھنڈی ٹھنڈی گھانس پر چلنے لگا

”وہ یہاں نہیں تھی....!!! اب اس کا ٹھکانہ یہ نہیں تھا....!!“ اس نے دکھ سے سوچا۔

آج اس نے اسے دیکھا تھا وہ جو اس کا عشق تھا جنون تھی اس کی محبت تھی بی جی کے آخری دیدار کے لیے جب وہ زنان خانہ میں آیا تھا وہ خاندان کی خواتین کے ساتھ بیٹھی بھیگی پلکوں سے بی جی کو دیکھ رہی تھی بی جی کا اور اس کا رشتہ تھا بھی بہت پرانا اور اتنا ہی گہرا بھی تھا اور شاید وہ اسی رشتے کی خاطر آخری بار ان کے دیدار کے لیے آئی تھی۔

وہ پہلے سے زیادہ شاداب اور کھلی ہوئی نظر آ رہی تھی اس نے اپنی آنکھیں بی جی کے بے جان چہرے پر ٹکائی ہوئی تھی آج بھی اس کی آنکھیں روشنی سی بھری تھی جیسے پہلے رہتی تھی ہر وقت ان میں زندگی کی نئی امید روشن صبح جگمگاتی رہتی تھی۔

اس کی رنگت میں ہلکی سی سرخی گھلی تھی چہرے پر وقار چھایا ہوا تھا اعتماد کا گہرا تاثر ابھرا ہوا تھا اس نے کاٹن کی بادامی رنگ کی سادہ سی ساڑی باندھی ہوئی تھی جس کا پلو اس نے قرینے سے سر پر ڈالا ہوا تھا اس کے گلابی ہونٹ کچھ پڑھنے میں مصروف تھے وہ کئی لمحے اس پر سے نظریں ہٹا نہ سکا۔

وہ لمحوں میں اپنے ماضی میں کھو گیا تھا اسے اچھی طرح یاد تھے وہ دن....!!! اس کا وہی دن اچھا گزرتا تھا جب الفیہ سے اس کا سامنا ہو جاتا یا اس سے جھڑپ ہو جاتی ویسے ایسا ہوتا بہت کم ہی تھا وہ جان بوجھ کر اس کی

راہوں میں آ کر اسے تاؤ دلا جاتا تھا۔

شروع شروع میں جب اس نے یونیورسٹی میں قدم رکھا تھا تو خاصی نروس اور ڈری سہمی بھی تھی اس نے بی کام گرلز کالج سے کیا تھا لیکن ایم کام کرنے کے لیے اسے یونیورسٹی کا رخ کرنا پڑا تھا ابتدا میں تو وہ بہت بوکھلائی دو تین دن تو بڑی پریشانی ہوئی مگر پھر اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی مگر اس کی بحال ہوئی خود اعتمادی اس وقت مفقود ہونے لگی۔

جب ارحم صفوان احمد اس کی راہوں میں آنے لگا ابتدا میں تو وہ محض کاریڈور کے ایک سرے پر کھڑا اسے دیکھ کر مسکرایا کرتا تھا اور وہ اسے نظر انداز کرتی رہی ارحم فائنل کا اسٹوڈنٹ مگر نہ صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ بلکہ ساری یونیورسٹی میں مشہور بندہ تھا ایک تو وہ بے حد ذہین اور قابل اسٹوڈنٹ تھا دوسرا یہ کہ اس کی شخصیت کافی سحر انگیز بھی تھی۔

مزید برآں کہ دولت مند بھی تھا اور شہر کے جانے مانے صنعت کار صفوان احمد کا بیٹا تھا۔ بیٹا بھی وہ جو اکلوتا ہو یوں ذہانت شخصیت اور دولت تینوں یکجا ہو کر اس کا قد بڑھا گئی تھیں پروفیسرز تو اس کی تعریف کرتے ہی تھے اسٹوڈنٹ بھی اس کے نام کے قصیدے پڑھتے نظر آتے تھے۔

یونیورسٹی کے ہر ڈیپارٹمنٹ میں اس کے ساتھی دوست تھے جن میں اکثریت لڑکوں کی تھی بہت کم وہ لڑکیوں سے باتیں کرتا نظر آتا تھا یہاں تک تو سب ٹھیک تھا مگر جب اسے پتا چلا کہ اسے گھورنے والا وہ لانبے قد کا اور براؤن آنکھوں والا شخص ارحم صفوان احمد ہے تو وہ کافی چڑ گئی تھی۔

یہ سوچ کر کے اتنی ساری خوبیوں کا مالک ہوتے ہوئے بھی ایسی حرکت کر رہا تھا وہ یونیورسٹی آتی تو وہ اسے کبھی گیٹ تو کبھی زینے کے پاس مل جاتا۔ اس کی زندگی کا مقصد حصول علم تھا کسی سے عشق نہیں لڑانا تھا اس خوبصورت سے شخص کی نگاہیں اسے اپنے وجود میں اترتی محسوس کر کے وہ بہت نروس ہوتی تھی۔

وہ اپنے لیکچر اٹینڈ کرتی اور گھر کی راہ لیتی مگر پھر یہ ہونے لگا کہ وہ جو خاموش نظروں اور مسکراتے لبوں سمیت اسے دیکھا کرتا تھا اب موقعہ بہ موقعہ اسے مخاطب کرنے لگا وہ خاموشی سے ایک طرف نکل جاتی کبھی جواب نہ دیتی خوب نظر انداز کرتی لیکن وہ بھی ڈھیٹ بنا ہوا تھا۔

”میں جانتا ہوں ....! تم بہت حقیقت پسند لڑکی ہو مگر تمھیں انسانوں کی پہچان نہیں تم نے مجھے ہمیشہ غلط سمجھا میں جب بھی تمھاری طرف بڑھا تم کترا کر نکل گئی میں اتنا برا بھی نہیں ہوں البتہ جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے....!!“ اس دن وہ لائبریری میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی اسے اکیلا پا کر وہ اس کے سامنے بیٹھا بڑے دلکش انداز میں مسکرا رہا تھا۔

وہ سراسیمہ سی ہو کر اٹھی اور جانے لگی تو اس نے ہاتھ تھام کر مضبوطی سے بٹھایا اور خاموش رہنے کے لیے اپنے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر اشارہ کیا جیسے وہ جتانے لگا تھا کہ لائبریری میں شور نہیں کرنا وہ دانت پیس کر بیٹھ گئی۔

”میں آپ کی عزت کرتی ہوں مگر آپ کی یہ حرکتیں.....؟؟؟ آپ انھیں کس خانہ میں فٹ کریں گے....!!“ وہ خاموش نہ رہ سکی اس نے اپنی کلائی کی طرف اشارہ کر کے اشتعال انگیز لہجے میں کہا جو اس کے مضبوط ہاتھ میں دبی تھی اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

”میری حرکتیں اتنی بری بھی نہیں تھی...!! صرف میں دیکھتا ہی تو تھا دو چار باتیں ہی کر لیتا تھا مگر تمھیں تو ہمیشہ مجھ سے بیر ہی ہے......!! ہر وقت انگارے چباتی رہتی ہو....!!!“ وہ سنجیدگی سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تو ماہین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا سچ ہی تو کہہ رہا تھا وہ اگر وہ کترانے کے بجائے نارمل انداز میں اس سے بات کر لیتی تو نارمل رویہ رکھ کر تو شاید عین ممکن تھا وہ بار بار اس کی راہیں نہ روکتا۔

اس نے تو اسے نظر انداز کر کے لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع دیا تھا جو وہ شوخ نظروں سے معنی خیزی سے اور اکثر جملے کستے ہوئے نکل جاتے تھے وہ اس سے کچھ کہہ نہ سکی غیر ارادہ طور پر اسے دیکھے گئی۔

”کیا سوچنے لگی....!!“ وہ شوخی سے مسکراتا ہوا پوچھنے لگا تو وہ جھینپ سی گئی۔

”کیا تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں....؟ کیا تم نے دیکھا نہیں میرے حلقہ احباب میں لڑکیاں برائے نام ہیں میں نے کبھی کسی لڑکی کی طرف پیش قدمی نہیں کی....!!! لڑکیاں خود ہی میری طرف بڑھتی ہیں...!! میں رئیس زادہ ضرور ہوں مگر بگڑا ہوا نہیں ہوں تم مجھے غلط مت سمجھو اعتبار کرو میرا ....!!“ وہ پھر سے اسے سمجھانے لگا۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے...!! پلیز میرا پیچھا چھوڑ دیں...!“ وہ چپ ہوا تو وہ کہتی ہوئی اٹھی اس نے کتابیں پھر سے سمیٹیں۔

”الفیہ ...!! میرے کسی رویہ سے تمھیں تکلیف پہنچی ہو تو میں شرمندہ ہوں انسان ہی ہوں غلطیوں سے مبرا تو نہیں ہوں ...!!!“ وہ پشیمانی سے کہتا ہوا واقعی نادم نظر آیا۔

”ارحم صاحب...!! میں ایک غریب لڑکی ہوں میں کب تک آپ کی نازیبا حرکتیں برداشت کروں ....؟؟؟ میں یہاں اپنی تعلیم حاصل کرنے آئی ہوں آپ سے عشق و عاشقی اور پیار و محبت کی باتیں سننے اور افسانے بننے نہیں آئی ہوں ....!!“ وہ ہاتھ جوڑتی دبی آواز میں ضبط سے

بولی وہ سرتاپا سرخ غصہ میں تپی ہوئی تھی۔

''کیا میں جانتا نہیں ہوں یہ بات ....؟'' اس نے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو وہ چونک کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''جب تمھیں پہلی بار یونیورسٹی میں دیکھا تو تم مجھے اچھی لگیں پھر ہر گزرتا دن مجھے یہ احساس دلا کر گزرنے لگا کہ میں تمھیں چاہنے لگا ہوں جس کا اظہار بھی میں نے تم سے کر دیا مگر تم نے مجھے غلط سمجھا....!!!!

تم کون ہو کہاں سے آتی ہو اور کس طبقے سے تمھارا تعلق ہے ہر بات میں جانتا ہوں مگر مجھے ان باتوں سے غرض نہیں ہے کہ تمھارے بابا ہماری فیکٹری کے منشی ہیں تم ہمارے ہی کوارٹر میں رہتی ہو بی جی سے تمھارے بچپن کے تعلقات ہیں....!!!

میرا رشتہ تو بلواسطہ اور بلاواسطہ تم سے ہے تمھاری ذات سے ہے اور میں تمھیں باعزت طریقے سے اپنانا چاہتا ہوں بس تمھارا ایم کام مکمل ہونے کا انتظار ہے کیونکہ ایم کام کرنا تمھاری زندگی کا خواب ہے مما میرا رشتہ لے کر تمھارے در تک ضرور آئیں گی انکار تو نہیں کرو گی نہ....!!!

وہ اپنی طویل بات سنجیدگی و بردباری سے ختم کرتے ہوئے شوخی سے پوچھنے لگا تو وہ کئی لمحے گنگ سی کھڑی رہ گئی اس نے تو سوچا تھا وہ حقیقت جان کر پیچھے ہٹ جائے گا مگر یہ بات تو نہ تھی وہ تو سب جانتے ہوئے بھی اس کا طلب گار تھا اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''بولو نہ۔ انکار تو نہیں کرو گی .....!!؟؟'' وہ اب کی بار لاڈ سے پوچھنے لگا اور وہ جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آ گئی

''نہیں....!!'' اس نے بے اختیار ہی نفی میں سر ہلایا

''میں اپنی تعریف تو نہیں کرتا مگر آپ کے اطمینان کے لیے بتا دوں کہ تمام زندگی میرے ساتھ بے پناہ مسرور رہیں گی میں آپ کو دکھی نہ ہونے دوں۔گا...!!!'' وہ سرشار ہو کر ہنس پڑا ہزاروں پھول اس کے دل میں کھل گئے کلیاں چٹخنے لگی آنکھوں میں محبت کی چمک لو دینے لگی اس نے گھنی گھنی پلکوں کو جنبش دی جو اٹھ نہ سکیں اس کے قدموں میں سجدہ ریز ہو گئیں۔

''چلو....!! ایک کپ کافی پی لو پھر تمھیں گھر چھوڑ دوں ...!!''

اس نے کہتے ہوئے قدم بڑھائے تو وہ بھی اپنی ساری غلط فہمی کو دور کر کے مسکراتی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑی۔

وہ روز بروز اس کے قریب آتی جا رہی تھی کہ اسے محسوس ہوتا جیسے نس نس میں بس گئی ہو دل کی دھڑکنوں میں چھپ گئی ہو ذہن میں جیسے چپک گئی ہو اس کی چاہت ہر لمحہ ہر لحظہ بڑھنے لگی تھی۔

فاطمہ آپی کی شادی تھی اور مینشن میں پہلی شادی تھی ارحم اپنے بہن کے لیے بہت خوش تھا اور شادی کی تیاریاں زور و شور سے کر رہا تھا۔

''فاطمہ آپی کی شادی میں چند دن رہ گئے ہیں تم کو گھر کا سارا کام سنبھالنا ہے...!!'' وہ شوخی سے حکم صادر کرتا اسے گھر لے آیا تھا فاطمہ آپی سادہ مزاج تھی اور وہ کافی عرصے سے الفیہ کو جانتی بھی تھی وہ۔ جلد ہی اس سے گھل مل گئی الفیہ گھر کے سارے امور سنبھالے بی جی کے پیچھے گھومتی رہتی تھی شادی کے دن بے حد قریب آ گئے تھے نئی سے نئی ذمہ داری ڈالی جا رہی تھیں۔

''بیٹی الفی تمھارے اوپر بہت سی ذمہ داریاں ڈال دی تھک کر چور ہو جاتی ہو ذرا آرام بھی کر لیا کرو...!!'' بی جی اسے یوں مصروف دیکھتی تو انھیں اس پر بے اختیار پیار آ جاتا اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیتی اور دھیرے دھیرے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ارحم بہت خوش تھا کام کرتی الفیہ پر بڑی شوخی و شرارت سے دیکھتا قسم قسم کے شوخ جملوں سے نوازتا شرارتیں کرتا البتہ بی جی کے سامنے اس کے ساتھ لیے دیے سے رویہ اختیار کرتا۔

''خود تو ائرکنڈیشنڈ کمرے میں کام کر رہی ہیں وہ بھی معمولی سا اور مجھے شیطان کی آنت جتنی لمبی فہرست تھما دی کہ سب بازار سے لے آؤ یہ بھی نہیں پتہ کہ کتنا تھک کر آ رہا ہوں آفس سے ...!!! بس مما کو تو اپنی بیٹی کی پرواہ ہے بیٹے سے کوئی محبت باقی نہیں رہی .....!! بیٹے کو گھن چکر بنا دیا ہے آفس کا چکر...!!! گھر کا چکر....!!! بازار کا چکر....!!! بھاؤ تاؤ کا چکر ....!!! مجموعہ بنا گھن چکر...!!'' وہ آتے ہی برہم ہونے لگا تو فاطمہ اس کا سر تھپکنے لگی الفیہ فرج سے دوڑ کر ٹھنڈا پانی لے آئی وہ تھانہ دار بنا پیر چڑھائے پانی پینے لگا تو وہ دونوں ہی ہنس پڑی۔

''الفیہ کو لے جاؤ اب فاطمہ تو آنے سے رہی..!! مما نے جلدی سے معاملہ نپٹا دیا اور مہمانوں والی فہرست پر جھک گئی۔

''اسے کہتے ہیں مراد بر آنا...!!'' وہ شوخی سے سرگوشی میں بولا اور فہرست جو ٹیبل پر پڑی تھی جلدی سے اٹھا کر جیب میں ٹھونسی تھی اور اسے لیے اس دن اس نے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ بھی کی تھی۔

''ارحم تم ہی اتنے پاگل بنے ہوئے ہو اس لڑکی کے کہ تمھیں یار دوست بھی یاد نہیں رہتے...!!'' عامر شکایت کرنے لگا وہ زور سے ہنسا۔

''تم جیسا وجیہہ ڈیشنگ لڑکا جس کے پاس دولت کی کمی ہے نہ حسن کی ایک ایسی غریب لڑکی پر دلنہار بیٹھا ہے حیرت ہے ....!'' عاقب تعجب سے کہہ رہا تھا۔ ارحم مسکراتے ہوئے جواب دینے ہی لگا تھا کہ عامر نے

ٹوک دیا۔

''یہی میاں مجنوں بنے اپنی لیلی کے طواف کرتے ہیں وہ تو انھیں اپنے لائق بھی نہیں سمجھتی ...!'' عامر نے کہا تو سب کے قہقہے فلک شگاف تھے۔

''ایسا ہرگز نہیں ہے وہ بھی مجھے اتنی ہی شدت سے چاہتی ہے جس طرح میں اسے پیار کرتا ہوں....!!'' ارحم نے ناگواری سے کہہ کر بات ختم کرنی چاہی تھی اسے اپنے دوستوں کی زبان سے الفیہ کا یوں تذکرہ بہت کھلنے لگا تھا۔

''تمھیں خود بھی پتہ ہے میرے دوست وہ بس تمھاری امارت سے مرعوب ہے اور کچھ نہیں ہے وہ تمھیں اتنی شدت سے نہیں چاہتی جتنا تم اسے اپنے دل میں اتار بیٹھے ہو آزمائش شرط ہے.....!!'' عامر کا لہجہ تمسخرانہ تھا ارحم نے سختی سے لب بھینچ لیے۔

''کیسی آزمائش....؟'' اس نے گھور کر عامر کو دیکھا۔

''فاطمہ آپی کی شادی پر سوہیں نہ اسی رات تم اسے رات بارہ بجے بلا لینا اگر وہ تم سے سچی محبت والہانہ پیار کرتی ہوگی تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوڑی چلی آئے گی ...!!'' عامر نے تجویز پیش کی ارحم کے نا چاہتے ہوئے بھی بات دل کو لگی تھی۔

وہ پہلے تو اس سے بیزار سی کتراتی رہتی تھی پھر اس کا اچانک مان جانا اس کی ہر بات ماننا یہ سب اچانک ہی ہوا تھا اور کبھی الفیہ نے اس کے دلی جذبات کو اس پر واضح طور پر تو دور ڈھکے چھپے الفاظ میں بھی قبول نہیں کیا تھا۔

شک کا زہر اس کے ذہن میں مچلنے لگا سب سے پہلے تو وہ ارحم کی خوشی نگل گیا اور پھر وہ اس کے دل میں الفیہ کے بارے میں بدگمانی کی جڑیں پھیلانے لگا لمحوں میں اس کے تاثرات بدل گئے اور ارحم کی نظروں میں مشکوک ہو کر بے اعتبار ہونے لگی۔

''کیا ہوا...!! ڈر گئے ...!! اتنی سی بات پر...!!'' عاقب نے عامر کو آنکھ ماری اور شوخی سے ہنسا۔

'عاقب ...!! یوں۔ زبردستی نہیں ہوتی دلوں کے رشتے میں تم چپ رہو ذرا...!!'' عامر نے چالاکی سے عاقب کو مصنوعی غصہ سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن بروقت ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا...!! رشتہ دل کا ہو یا خون کا آزمانے میں کیسا خوف...!!'' عاقب کندھے اچکا کر لاپرواہی سے بولا ارحم جو خاموش کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا چونک گیا۔

''تو ٹھیک ہے نہ اسے بھی آزما لیتے ہیں ...!!'' ارحم نے موبائل نکال کر اس کا نمبر ڈائل کیا پہلی بار...!!

دوسری بار....!!!

تیسری بار....!!

الفیہ بی جی کے ساتھ تھی تو اس نے اس کی کال اٹھانا ضروری نہیں سمجھی تھی ارحم نے تلملا کر فون کان سے ہٹایا عامر نے عاقب کو آنکھ ماری ان کی مکاری عروج پر تھی جب سے ارحم الفیہ کے عشق میں گرفتار ہوا تھا عامر کا رویہ بدل گیا تھا وہ بھی ارحم کی طرح ایک امیر کبیر باپ کی اولاد تھا اور گھر بھر میں سب سے بڑا اور زمیندار بھی تھا۔ اس کی سنجیدگی سے متاثر ہو کر ہی تو ارحم نے اس سے دوستی کی تھی۔

''دیکھا میں نے صحیح کہا تھا نہ..!!'' عاقب نے جیبوں میں ہاتھ ڈالا ارحم بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا اسے اپنے دوستوں کے سامنے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

''میں اسے براہ راست بات کروں گا اور آنے کے لیے کہوں گا اور جب وہ آجائے گی تو تم اپنے چہروں پر کالک مل لینا...!!'' ارحم پیر پٹختا وہاں سے اٹھ گیا۔-

اس نے بھرپور والہانہ محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا جو تیز گلابی کپڑوں پر اسی رنگ کے ٹشو کا کرن کہا ٹکا دوپٹہ پشت اور شانوں پر پھیلائے بالوں کو کھلا چھوڑا تھا۔ میک اپ بھی پورا کیا تھا ماتھے پر بندی کانوں میں جھمکے بالوں میں گجرے نیئوں میں کجرے پہنے وہ بہت دلفریب و دلکش لگ رہی تھی وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔

ساری چیزیں اس نے زیب تن کی تھی جو جو ارحم نے اسے خرید کر دی تھی کتنے سالوں بعد وہ یوں کھل کر تیار ہوئی تھی یوں سجی سنوری تھی اپنے محبوب کے لیے ہر طرح سے نکھر گئی تھی

''اب ایسے ہی مجھے دیکھتے رہیں گے یا کچھ کہیں گے بھی...!'' وہ شرما کر مسکراتی ہوئی بولی تو وہ ایک دم ہوش میں آیا عامر کا جملہ اس کی سماعت میں تلخی سی گھول گیا۔

''فاطمہ آپی کی وداعی کے بعد چھت پر آنا تمھارے لیے ایک سرپرائز ہے..!!'' اچانک ہی اس کے چہرے کا رنگ بدلا الفیہ کچھ حیران ہوئی۔

''وداعی کے بعد...!!'' اس نے دوہرا کر تصدیق چاہی ارحم نے سر ہلایا۔

''لیکن وداعی کے بعد تو بڑی دیر ہو جائے گی گیارہ سے بارہ بھی بج سکتے ہیں ...!!'' اس نے اپنی بڑی بڑی معصوم سی آنکھوں میں حیرانی بھر کر کہا ارحم کا دل چاہا اس کی معصومیت پر ایمان لے آئے لیکن جی کڑا کر

کے کہنے لگا۔

''تو کیا ہوا بارہ بجے یا ایک تمھیں آنا ہوگا...!!'' وہ کہہ کر رکا نہیں دھم دھم کرتا باہر نکل گیا جانے اسے کس بات کا غصہ تھا وہ کچھ لمحے یونہی کھڑی ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتی رہی جہاں سے کچھ لمحے پہلے ہی وہ نکلا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا اس کی بات پر وہ غور کرتی رہی۔

''ارحم صاحب...!! میں رات کے اندھیرے میں ملنے والی محبت کو محبت تصور ہی نہیں کرتی..!! میں پل پل آپ کی محبت میں ڈھل کر نکھر گئی ہوں میری محبت پاکیزہ ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے والدین میرے خاندان اور میرے وجود کی کوئی عزت نہیں کوئی وقار نہیں......!!! جو میں یوں آپ کے عشق کی دیوانگی میں آدھی رات کو اٹھ کر اپنی اور اپنے والدین کی عزت کو اچھالتی پھروں....!!!'' الفیہ نے سختی سے دانت پر دانت جمائے ہوئے تلخی سے سوچا پھر وہ رکی نہیں تھی نکاح ہوتے ہی طعام سے پہلے ہی وہ گھر لوٹ گئی۔

ارحم وداعی کے بعد اس کا انتظار بے صبری سے کرنے لگا تھا وہ اسے دلہن کے آس پاس پی جی کے کاموں میں کہی نظر نہیں آئی تھی ساری رات وہ کھلی چھت پر ٹہلتا رہا تھا جب فجر کی اذانیں ہونے لگی تو وہ تھکے تھکے قدموں سے نیچے اتر آیا ساتھ ہی اس کے دل میں الفیہ کے لیے حد درجہ غصہ بھی اترنے لگا تھا اس نے اس کی اس حرکت کو اپنی تذلیل اور انا کا مسئلہ بنالیا۔

اس کے انگ انگ سے غصہ پھوٹنے لگا تھا رات بھر کا جاگا اور دن بھر کام میں مصروف تھکا ہوا ہونے کے باوجود بھی کروٹیں بدلتا رہا تھا اسے کسی پل چین نہیں تھا جب بستر پر کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا تو غسل کے لیے چل گیا جانے کتنی دیر شاور کے نیچے کھڑا وہ اپانی بہاتا رہا تھا جب تھک گیا تو باہر نکلا۔ اس کی کھنکتی آواز سن کر تلملا اٹھا جلدی جلدی کپڑے پہن کر کنگھا کیا اور اپنے وجود پر اسپرے کرتا ہوا وہ تیزی سے باہر آیا۔

وہ کسی کام سے کچن کی طرف جا رہی تھی ہلکے پستہ کلر کی قمیص جس پر ہلکا ہلکا گولڈن ورک تھا اس پر ہم رنگ چوڑی دار پاجامہ پہنے گولڈن اور پستہ کلر کے امتیازی رنگ کا دوپٹہ شانوں پر پھیلائے وہ ہشاش بشاش سی شوخیوں میں مصروف تھی اسے یوں بے نیاز ہنستا کھیلتا دیکھ ارحم مزید سلگ اٹھا اس نے اسے تھام کر کھینچ لیا اور پچھلی کوریڈور میں اسے دھکیلنے کے انداز میں دیوار کی طرف کیا۔

''تم نے مجھے اس قدر بے اعتبار کیوں کیا..!!! کیا بس اتنی سی وقعت تھی میری اتنی ہی چاہت ہے اتنی ہی عزت ہے...!! میں نے تمھیں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بلایا تو تم...!!'' آگے وہ اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھورنے لگا اس کے رویہ پر وہ حیران پریشان سہمی ہوئی تھی اس کے کہنے پر وہ جیسے تلملا اٹھی۔

''عزت دار شخص آدھی رات کو پرائی لڑکیوں کو چھت پر تن تنہا نہیں بلاتے....!'' اس نے سخت وسرد آواز میں اسے بہت کچھ جتایا تھا ارحم ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا ڈگمگایا پھر جلد ہی سنبھلا۔۔

''میں نے ایسی بھی کوئی عجیب خواہش نہیں کی تھی ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں ہم شادی کرنے والے ہیں یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی...!!'' ارحم نے کھوکھلے لہجے میں اپنی بات منوانی چاہی۔

''اوہ اچھا...!!!! اگر یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے تو کیا آپ کو گوارہ ہوتا کہ فاطمہ آپی کے شوہر شادی سے پہلے ان سے آدھی رات کو ملنے کی خواہش کرتے.......!!'' آگے الفیہ کے گلابی گال پر ارحم کا زناٹے دار تھپڑ پڑا تھا وہ گنگ سی کھڑی رہ گئی۔

''آ گئی نا اپنی اوقات پر....!! بدتمیز لڑکی میں نے تمھیں فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھانے کی کوشش کی اور ایسی گھناؤنی بات میری آپی کے لیے کرتے تمھیں ذرا شرم نہ آئی..!!'' ارحم غصہ سے تانبے کی طرح سرخ ہو رہا تھا الفیہ نے اپنی اشکوں بھری آنکھوں سے اسے سر اٹھا کر دیکھا۔

''بہت اچھی بات ہے ابھی غیرت باقی ہے ماشاءاللہ...!!'' اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا اس نے اپنا سلگتا گال سہلایا۔

''جو بات کسی اور کی بہن سے کر کے اسے جائز قرار دے رہے ہو وہی بات اپنی بہن کے لیے ناجائز اور غیرت کی للکار کیوں بن گئی...!!'' الفیہ کا لہجہ تلخ اور چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔

''الفیہ....!!'' ارحم نے زور سے چیخ کر اسے خاموش کیا اور دندناتا گھر سے باہر نکل گیا وہ بھربھری مٹی کی طرح بیٹھتی چلی گئی آنسو اپنی شدت سے سسکیوں کے ساتھ بہنے لگے تھے۔

''ارحم کیا بات ہے اب تک سوئے نہیں..!!'' روزینہ۔ نرمی سے کندھے پر ہاتھ رکھا بے شک وہ ایک اچھی شریک سفر ثابت ہوئی تھی لیکن الفیہ......!!!

''آج طبیعت کچھ بے چین سی ہے...!! تم آرام کرو میں آ رہا ہوں...!!'' ارحم نے اس کا ہاتھ ہٹایا اور لان کی ہری ہری گھانس پر چلنے لگا وہ غصے سے گھر ہی نہیں انڈیا سے بھی چلا گیا تھا کچھ سال بعد اس نے مما پاپا کی خواہش پر روزینہ سے شادی بھی کر لی تھی لیکن ایک پھانس سی اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ گیا تھا کہ الفیہ کتنی درست تھی اپنے والدین خاندان اور اپنی عزت کی محافظ اس کے دل کی عاشقی ایک سچی اور وفادار ساتھی تھی جس نے اپنا آپ صرف اور صرف اپنے مجازی خدا کے لیے محفوظ رکھا تھا وہ ایک بہترین انتخاب تھی اس کی پہلی محبت جسے وہ شاید ہی بھول پاتا اور اسے یوں آٹھ سال بعد دیکھ کر اس کا دل مچل گیا تھا اسے پانے کی حسرت دل میں جاگ گئی تھی اسے کھونے کا دکھ اسے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

اسے جس نے کھوٹا سکہ سمجھ کر ٹھوکر ماری تھی وہی ہیرا تھا اور ہیرے کی قدر صرف جوہری ہی جان سکتا ہے اور وہ جوہری خود عامر ہمدانی ثابت ہوا تھا جس نے اس کے دل میں شک کا بیج بویا اور خود الفیہ سے شادی کر لی۔

اس رات صرف ارحم نے ہی آنکھوں میں نہیں کاٹی تھی۔ اس کے ساتھ عامر بھی جاگتا رہا تھا اس کے دل میں جانے کتنے برسوں سے الفیہ کی چاہت کروٹ لیتی رہی تھی لیکن وہ اپنی ذمہ داریوں کے آگے خاموش کھڑا تھا پچھلے سال اس کے بابا کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا گھر کاروبار اور بھائی بہنوں کی ذمہ داری نے اسے الجھا کر رکھ دیا تھا اسے ایک ایسی سمجھدار شریک سفر کی ضرورت تھی جو اس کے بکھرے وجود کے ساتھ ساتھ اس کے بکھرے گھر بھائی بہن اور ماں کو بھی سمیٹ لیتی اور اس کی دور اندیش آنکھوں نے الفیہ کو پہچان لیا تھا لیکن جب اسے ارحم اور اس کے رشتے کا علم ہوا تو وہ ٹوٹنے لگا اس لیے اس نے ایسی شرط کے ذریعے الفیہ کو آزمانا چاہا جس میں وہ صد فیصد کامیاب ہو گئی اور عامر کے دل میں اس کا مقام کچھ اور اونچا ہو گیا۔

عامر کا اندازہ الفیہ کے بارے میں بالکل درست ثابت ہوا اس نے نہ صرف اس کے بکھرے وجود کو سنبھالا اس کے گھر بھائی بہنوں اور ماں کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی آخری وقت میں ماں اسے دعائیں دیتی نہ تھکتی تھی۔ بہنوں کی شادی اس نے اپنی ذمے داری نبھاتے ہوئے اچھے گھرانوں میں کی بھائیوں کی شادیوں کے بعد سارے گھر کو موتی کی مالا کی طرح پرو کر رکھا ان آٹھ سالوں میں دو پھول سے بچوں کا تحفہ اسے دیا گھر کی آسودگی کاروبار میں منافع گھر میں بڑے ہونے کی ایک پختہ حیثیت عزت رتبہ بنا کر عامر کو اس نے پوری طرح بسایا تھا عامر دن بدن اس کے عشق میں گرفتار ہوتا جاتا تھا اس کے بغیر زندگی کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔

”میں جانتی ہوں مرد اپنی انا کے آگے کسی کو نہیں مانتا اور اگر وہ ایک عورت ہو تو وہ جیسے اس کی ضد بن جاتی ہے اس رات صرف ارحم اور عامر ہی نہیں جاگ رہے تھے میں بھی کانٹوں کے بستر پر لیٹی جاگ رہی تھی میرے لیے اپنی عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا اور ارحم سے میرا ایسا قریبی رشتہ نہیں تھا جس کے بھروسے میں رات کے ایک بجے اس سے ملنے جاتی....!!!!

ارحم کے جانے کے کچھ مہینے بعد ہی بابا نے عامر کا ذکر کیا جو کئی مہینوں سے میرا ہاتھ باعزت طریقے سے مانگ رہا تھا اور ساری چھان پھٹک کے بعد بابا نے میری زندگی کا وہ فیصلہ کر دیا تھا جس کے خواب میں نے ارحم کے ساتھ دیکھے تھے شادی کے ساتھ ہی مجھ پر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا گیا تھا سب کے رویے کو سمجھ کر ان کے مطابق خود کو ڈھالنا اور ان کے آرام اور سکون کا خیال رکھتے رکھتے میرا وجود کہیں گم ہو گیا تھا میں پگھل گئی تھی کئی حصوں میں بٹ گئی تھی۔

اور اس دن مجھ پر یہ انکشاف ہوا جب عاقب اور عامر اس پرانے قصے کا ذکر کر رہے تھے میں جیسے ٹوٹ کے بکھر گئی میرا وجود کرچی کرچی ہو گیا ایک شخص نے مجھے انا کا مسئلہ بنا دیا ایک نے تختۂ آزمائش بنا دیا۔

آج بی جی کے آخری دیدار کے ساتھ میں نے آٹھ برس بعد اس کا بھی دیدار کیا اس کی آنکھوں میں چمکتے گہرے حزن و ملال نے مجھے بھی دکھی کر دیا وقت نے اسے بدل تو دیا تھا لیکن مجھے وہ اب بھی ویسا ہی لگا جیسے برسوں پہلے لگتا تھا اور جب عامر مجھے لینے آئے اور اس نے ہم دونوں کو دیکھا کتنا حیرت زدہ تھا وہ کیسی حسرتیں اس کی آنکھوں میں جاگ اٹھی تھی عامر اس سے پرجوش انداز میں ملا اور میں پہلو میں کھڑی اس کی جیت کا جشن مناتی آنکھیں تکتی رہی مجھے جیتنے کا مجھے پانے کا غرور اس کی آنکھوں میں جھلملا رہا تھا میں نے کار کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے عامر سرگوشی نے آخری الفاظ سنے تھے جو وہ ارحم سے جھک کر رازداری سے کہہ رہا تھا۔

”آزمائش شرط ہے....!!؟“

پھر بھی انجان بنی میں اس کے ساتھ بیٹھ کر کتنے اعزاز کے ساتھ واپس آئی تھی وہاں جہاں میرا ایک مقام بن گیا تھا میری یہ چھوٹی سی سلطنت تھی جس کی حاکم میں تھی عورت ہوں نہ......!! کہیں کسی مرد کی عزت ہوں تو کہیں غیرت بن جاتی ہوں۔

□□□

Syeda Aiman Abdus Sattar
Al-Hayat Apartment No. 1
Riyaz Colony
Take Nagar Juna Renapur Naka
Latur-413531(M.S)

اولڈ ایج ہوم

فرحت جبین

چلچلاتی دھوپ میں عرشان کی کار فراٹے بھرتی ہوئی اپنی پوری رفتار سے سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ عرشان کی ماں فاخرہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ فاخرہ کا عرشان کے سوا کوئی نہیں تھا۔ فاخرہ شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی کے دو سال ہی گذار پائی تھی۔ وہ دو سال کا قلیل عرصہ فاخرہ کی زندگی کے حسین ترین لمحات میں سے تھے۔ چاہنے والا شوہر، بنگلہ، نوکر چاکر وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی تمنا ہر لڑکی کرتی ہے۔ مگر قسمت کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے فاخرہ کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ یوں فاخرہ کی ہنستی کھیلتی دنیا اُجڑ گئی۔ ان کرب ناک لمحات میں عرشان (جو ان دونوں کی محبت کی نشانی تھی) اس کے لیے موہوم سی امید کی کرن تھا، جس کے لیے وہ اپنے وجود کو برداشت کرتی رہی۔ ایک سال کا ننھا معصوم عرشان جب مسکرا کر ماں کی طرف دیکھتا تو وہ اپنا غم سب کچھ بھول جاتی۔

دن مہینوں اور مہینے سال میں گزرتے چلے گئے۔ فاخرہ نے عرشان کی تعلیم میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اُس نے اُس کو ڈاکٹر بنایا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ اب ایک مقامی ہسپتال میں ڈیوٹی دیکھ رہا تھا۔ یوں تو عرشان کو بیرونِ ملک جانے کی بڑی چاہ تھی مگر فاخرہ ہمیشہ یہی کہتی، ”بیٹا دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی، اپنے وطن عزیز میں نہ جانے کتنے لاچار، بے بس، غریب لوگ ہیں، جن کا ٹھیک سے علاج بھی نہیں ہو پا رہا ہے۔ تم ان کے لیے مسیحا بن جاؤ، اور خدمت خلق میں اپنی زندگی لگا دو۔ اس سے ہمیں جو ذہنی اور روحانی مسرت حاصل ہوگی وہ تم ساری دنیا کی دولت پا کر بھی حاصل نہیں کر سکتے۔“ ماں کی باتوں کو سُن کر عرشان اکثر مسکرا کر رہ جاتا۔ اُس کو ماں سے بے پناہ محبت تھی، وہ ماں کی باتوں کو کبھی نہیں ٹالتا تھا۔

پچھلے سال ہی عرشان کی شادی ایک حسین و جمیل امیر ترین لڑکی سے ہو گئی تھی، شادی میں عرشان کی محبت شامل تھی، جس کو فاخرہ نے خوشی خوشی

منظور کرلیا۔ یوں اُن کے گھر خوشیوں کے دیپ جل اُٹھے۔ عرشان کی دلہن منہاز کی بھی خواہش تھی کہ باہر کی دنیا گھومیں پھریں۔ اُس کو ساس سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ عرشان کی خاطر بظاہر بناوٹی محبت اور چاہت کا مظاہرہ اپنی ساس سے کرتی رہی۔ عرشان اپنی محبت کو پاکر بے پناہ خوش تھا۔ منہاز عرشان کے دل و دماغ میں پوری طرح رچ بس گئی تھی۔ مگر منہاز ساس کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھتی تھی اور اپنے دل میں نفرت کی آگ سلگائے بیٹھی تھی۔

ادھر بے چاری فاخرہ کبھی بھی اپنی بہو کی چال کو نہ سمجھ سکی۔ ویسے وہ تھی ہی محبت لٹانے والی، ہمدرد، غمگسار، غریبوں کی مسیحا، مثبت سوچ کی مالک، اپنے اور پرائے میں ہر دل عزیز، ہر کوئی اُس کے پاس آکر اُس کی باتوں سے محفوظ اور مطمئن ہوتا تھا۔

فاخرہ ہر ایک کو پیاری تھی، بس کھٹکتی تھی تو صرف اپنی بہو کو۔ ماں کا اپنے بیٹے سے بے پناہ پیار اُس کے لیے ایک مسئلہ تھا اور اس پیار کو وہ ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔ مگر تھی وہ بڑی شاطر اپنے شوہر کو مٹھی میں لینا اور مکر و فریب سے اپنے جال میں محسور کرنے کا فن خوب جانتی تھی۔

رفتہ رفتہ عرشان اپنی چہیتی بیوی کی باتوں میں آنے لگا، اس کی جادوئی اور طلسماتی باتیں اُس کو حقیقی دنیا سے دور کرنے لگی، حتیٰ کہ اب اس کو اپنے ماں کے ساتھ وقت گزارنا بھی گراں گزرنے لگا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ منہاز کی گرفت میں پوری طرح آ گیا۔ منہاز موقع کی تاک میں تھی اور وہ یہی چاہتی تھی کہ "سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے"۔ منہاز کے سحر میں اب وہ اپنی ماں کو بھلا بیٹھا۔

"وہ ماں جس نے اپنی جوانی کو تیاگ دیا، وہ ماں جس نے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا دی، خاندان والوں کی باتیں کو سنی ان سنی کرتی رہی، خاندان کے لوگوں نے دوسری شادی کے لیے دباؤ ڈالا مگر اس نے اپنے خاندان والوں کی ناراضگی مو ل لینا پسند کیا مگر اپنی زندگی میں کسی دوسری ہستی کے وجود کا خیال نہ کیا۔ بس اس کی ساری زندگی کی کمائی عرشان ہی تھا۔ اپنی محبت کی اس نشانی کو اپنے سے جدا کرنا پسند نہ کیا۔"

وہ ماں جس نے اپنی جوانی کو تیاگ دیا، وہ ماں جس نے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا دی، خاندان والوں کی باتیں کو سنی ان سنی کرتی رہی، خاندان کے لوگوں نے دوسری شادی کے لیے دباؤ ڈالا مگر اس نے اپنے خاندان والوں کی ناراضگی مول لینا پسند کیا مگر اپنی زندگی میں کسی دوسری ہستی کے وجود کا خیال نہ کیا۔ بس اس کی ساری زندگی کی کمائی عرشان ہی تھا۔ اپنی محبت کی اس نشانی کو اپنے سے جدا کرنا پسند نہ کیا۔

ماں کی قدر اُس ہستی سے پوچھو جس نے اپنی ماں کو کھویا ہے۔ کتنی تڑپتی اولادیں ایسی ہیں جو ماں کے آنچل کے لمس کو محسوس کرنا چاہتی ہیں، زندگی کی دوڑ دھوپ سے تھک ہار کر ماں جیسے عظیم سائبان کی تلاش کرتی ہیں۔

آخر وہ قاتل گھڑی آ پہنچی کہ ایک دن منہاز نے کُھلے عام عرشان سے بغاوت کر ڈالی کہ اب میں کسی بھی صورت میں تمھاری ماں کو برداشت نہیں کرسکتی۔ تمھاری بوڑھی ماں کے لیے میں اپنا مستقبل برباد نہیں کر سکتی۔ مجھے ہر حال میں ولایت جانا ہے، تم اپنی ماں کا کسی دوسری جگہ انتظام کردو۔

عرشان تھوڑی دیر کے لیے سہم سا گیا، بظاہر وہ اپنی ماں سے دور ہو گیا تھا مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ یک لخت اُس کو اپنی زندگی سے الگ کر دیتا۔

اُس نے منہاز کو بہت سمجھایا مگر غرور و تکبر نے منہاز کی آنکھوں میں پٹی باندھ دی تھی۔ اُس نے ذرا بھی نہیں سوچا کہ عرشان کے سوا اُس کی ماں کا اس دنیا میں کوئی مہربان نہیں۔

ایک دن منہاز نے مشورہ دیا کہ اگر ہم ماں کو کسی رشتہ دار کے حوالے کرتے ہیں تو ہماری اچھی خاصی بدنامی ہوجائے گی۔ کیوں نہ ہم تمھاری ماں کو اولڈ ایج ہوم (old age home) چھوڑ کر بیرون ملک چلے جائیں، کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ ہم نے تمھاری ماں کے ساتھ کیا کیا اور ہر ماہ بلا ناغہ ہم پیسے بھیجتے رہیں گے۔ یوں تمھاری ماں بہ حفاظت رہے گی۔ عرشان نے اس بات کو نہ مانا تو منہاز نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور عرشان سے طلاق کا مطالبہ کرنے لگی۔ دونوں کی ایک ننھی سی بیٹی تھی، عرشان اپنی بیٹی سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے جدائی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ انسان کو اپنی بیوی اور بچوں کے لیے محسن، غم گسار، ہمدرد، لاڈ و پیار اور چاہت بکھیرنے والا بننا چاہئے مگر کبھی اپنے بیوی بچوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی نہیں بننا چاہیے ورنہ زندگی مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ بس عرشان کٹھ پتلی بن کر رہ گیا اور اپنی ماں کو ایسی پُرخار راہوں میں چھوڑنا پسند کیا جس میں جسم تو کیا روح تک زخمی ہوجائے۔

عرشان نے اپنی اور اپنی بیوی کے پاسپورٹ کی تیاری کرلی اور چپکے سے ماں کے لیے بھی سارے انتظامات کرلیے کہ فاخرہ کو اس کی بھنک

بھی نہ لگ پائی۔ ایک دن ایسا بھی آیا کہ عرشان اپنی ماں کو لے کر نکل پڑا۔

عرشان کی کار دو منزلہ عمارت کے سامنے رک گئی۔ فاخرہ جو آنکھ بند کیے بیٹھی تھی اچانک کار کے رُکنے پر اس کی آنکھ کھل گئی وہ اپنے بیٹے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی، گویا یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔

عرشان اپنی ماں سے مخاطب ہوا، ''ماں باہر آ جاؤ''، فاخرہ جب کار سے اُتری تو وہ اپنی ماں کو لے کر عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ عرشان میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ وہ اپنی ماں سے کچھ کہتا۔ بزدل انسان بس اپنی ماں سے اتنا کہہ سکا کہ ''ماں تم تھوڑی دیر یہیں رکو، مجھے ضروری کام آ گیا ہے، واپسی میں تمھیں لیتا جاؤں گا۔'' اور ہال میں بٹھا کر وہ باہر چلا گیا۔

معصوم سی فاخرہ کو پتہ ہی نہیں چلا کہ جس اولاد کے لیے اُس نے اپنی بھری جوانی تیاگ دی تھی وہ بوڑھاپے میں اُس کے لیے سہارا بننے کے بجائے اس کے وجود کی بنیادوں کو ہلا دے گا۔

فاخرہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی تو عرشان کے واپسی تک اُس نے عمارت کی سیر کرنا چاہا اور اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ ہال کے دوسری جانب بے شمار کمرے بنے ہوئے تھے جہاں عمر رسیدہ عورتیں آ جا رہی تھیں۔ فاخرہ کو حیرانی ہوئی کہ یہ کیسی جگہ ہے جہاں نہ بچے نہ جوان نہ مرد حضرات، صرف بوڑھی عورتیں ہر طرف نظر آ رہی ہیں۔ فاخرہ کو تجسس ہوا، اُس نے دل میں سوچا کہ عرشان کے آنے تک ہم اُن سے بات چیت کر کے اپنا وقت گزار لیں۔ مظلوم فاخرہ کو پتہ نہیں تھا کہ اب اُس کو ہمیشہ کے لیے اُن کے درمیان رہنا ہے۔

فاخرہ بڑھ کر ایک عورت سے مخاطب ہوئی جو حسرت و یاس کا پیکر لگ رہی تھی۔

''بہن! یہ کون سی جگہ ہے، تم سب یہاں کیا کر رہی ہو۔'' فاخرہ نے پوچھا۔

اُس عورت نے سرتاپا فاخرہ کو دیکھا اور زور سے کہا، ''خوش آمدید بہن، ہم مظلوم عورتوں کی دنیا میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔''

اُس عورت کی آواز پر کئی عورتیں فاخرہ کے اطراف جمع ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لیے فاخرہ خوفزدہ ہو گئی اور کپکپاتی ہوئی آواز میں کہنے لگی، ''تم سب کون ہو؟ اور یہاں کیا کر رہی ہو؟''

ایک عورت نے پوچھا'' کیوں بہن؟ تمھیں اپنی اولاد نے دُھتکارا، یا بہو نے۔'' فاخرہ نے زور سے نعوذ باللہ کہا اور بلند آواز میں کہنے لگی، ''کیسی واہیات باتیں کرتی ہو، نہ مجھے بیٹے اور نہ بہو نے دھتکارا ہے، بس تھوڑی دیر کے لیے میں یہاں رُکی ہوں اور عرشان کے آتے ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔ تم سب کون ہو؟ یہ کیسی جگہ ہے؟''

''ایک عورت ہنس پڑی اور دور ایک کونے میں بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی، ''وہ دیکھو رہی ہو نا، اُس نے بھی یہاں داخل ہو کر ایسا ہی کہا تھا کہ بس تم سب خاموش ہو جاؤ اور اپنی زبان سے ایسی بد بختی کی باتیں نہ کہو۔ میرا بیٹا آئے گا اور مجھے ابھی لے جائے گا پورے دو سال گذر گئے نہ بیٹا آیا اور نہ ہی اس کی آس گئی، وہ دیکھو وہ کیا زیر لب گنگنا رہی ہے۔''

ایک عورت ہنس پڑی اور دور ایک کونے میں بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی، ''وہ دیکھ رہی ہو نا، اُس نے بھی یہاں داخل ہو کر ایسا ہی کہا تھا کہ بس تم سب خاموش ہو جاؤ اور اپنی زبان سے ایسی بدبختی کی باتیں نہ کہو۔ میرا بیٹا آئے گا اور مجھے ابھی لے جائے گا۔ پورے دو سال گذر گئے نہ بیٹا آیا اور نہ ہی اس کی آس گئی، وہ دیکھو وہ کیا زیر لب گنگنا رہی ہے۔''

فاخرہ ڈرتے ڈرتے اُس عورت کے قریب پہنچی وہ زیر لب کہہ رہی تھی، ''تم سب جھوٹے ہو، وہ آئے گا۔ میرا بیٹا بے وفا نہیں وہ مجھے لینے آئے گا۔ میں اپنے پوتے پوتی کو گود میں لے کر کھلاؤں گی۔'' یہ دردناک منظر دیکھ کر فاخرہ کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

کمرے کی دوسری جانب دریچے کے پاس ایک عورت کھڑکی کی جالی تھامے باہر کی جانب مسلسل دیکھ رہی تھی جہاں سے داخلی دروازے کا راستہ کھلتا تھا۔

وہی عورت جس نے فاخرہ کو خوش آمدید کہا تھا قریب آ کر کہنے لگی، ''اُس بے چاری کو یہاں آئے چار سال گذر گئے مگر اس کا انتظار ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ وہ اب بھی اپنے بیٹوں کا انتظار کر رہی ہے۔'' حقیقت یہ ہے کہ ''ایک ماں کئی اولادوں کو برداشت کر سکتی ہے مگر کئی اولادیں مل کر ایک ماں کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔''

کسی عورت کو اپنی بیٹی نے چھوڑا ہوا تھا، کسی کو بہو نے، اُس عورت نے ایک طرف اشارہ کیا تو فاخرہ کی نظر اُس طرف اُٹھ گئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ ایک عورت گڑیا کو سینے سے لگائے ہوئے بے اختیار بار بار اُس کو چوم رہی ہے، پتہ چلا کہ یہ عورت اپنے حواس کھو بیٹھی ہے۔ اُس کی

اکلوتی اولاد اُس کو بے یار و مددگار یہاں چھوڑ گئی ہے۔

''اگر تمھاری اولاد تمھیں نہ لینے بھی آئے تو کوئی بات نہیں میں تم سب کو نکال لے جاؤں گی، اپنے حویلی میں تمھیں وہ آرام مہیا کروں گی کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔ میں حق کے لیے آواز اُٹھاؤں گی اور تمھارا حق تمھیں دلا کر رہوں گی۔'' فاخرہ نے جوش میں بلند آواز میں کہا۔

یا خدا! یہ کیسی اولاد ہے جو اُس ہستی کو ہی بھول گئی جس کی کوکھ نے انھیں جنم دیا۔ میرے اللہ! رحم فرما۔ جس نے ماں کے مقام کو نہ جانا اُس نے اپنی زندگی میں سب کچھ کھو دیا۔ فاخرہ نے اپنے دل میں سوچا کہ اس سلسلے میں میں عرشان سے بات کروں گی اور ان بے سہاروں کے لیے ایک سہارا بن جاؤں گی اور انھیں یہ احساس ہی ہونے نہیں دوں گی کہ یہ بے یار و مددگار ہیں۔ ان لوگوں کی خطا ہی کیا ہے؟ یہ اپنی جوانی کھو چکی ہیں۔ کبھی اولاد نے یہ نہ سوچا کہ ان کی جوانی کی بہاریں کس کی نذر ہوئی، کس کے ناز و نخرے اُٹھاتے ہوئے یہ ہاتھ پاؤں میں رعشہ پیدا ہوا۔ یہ وہی ہاتھ ہیں جس نے تمھیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تمھارا پہلا قدم فرش پر پڑتے دیکھ پھولے نہ سماتی وہی ماں جس کے لیے تم اجنبی بن گئے۔ فاخرہ کا لمحہ لمحہ بڑی بے چینی میں گذر رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں اُس کے لیے بہت اذیت ناک ہو گئیں تھیں۔ پل پل اُس کو یہاں گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بڑی یاس و حسرت سے عرشان کا انتظار کرنے لگی۔ پتہ نہیں عرشان کو کون سا ایسا ضروری کام یاد آ گیا کہ اُس نے اُس کو یہاں لا کر چھوڑ دیا۔ پھر فاخرہ نے دل میں سوچا کہ چلو اسی بہانے اُس نے بے رحم دنیا کو دیکھا۔ اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اس نے نڈھال سی ہو کر کرسی کا سہارا لیا۔

"وہ لڑکی جو فاخرہ سے مخاطب ہوئی تھی وہ فاخرہ سے نظریں ملا نہیں پائی اور جُھکی نظروں سے اداس لہجے میں کہنے لگی کہ" بہن فاخرہ ! تمہارا بیٹا عرشان تمہیں ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑ گیا ہے ۔ ہمارے دفتر سے اُس نے تمہاری یہاں رہائش کے سارے کاغذات مکمل کرلیے ہیں اور ابھی ابھی وہ تمہارا سامان دے کر گیا ہے ۔ '' اُس لڑکی کے ہاتھوں جب فاخرہ نے اپنا بیگ دیکھا تو لرز اُٹھی اور کربناک آواز میں چلائی۔"

دفعتاً اُس کو ایک آواز سنائی دی، ''بہن آپ ہی فاخرہ ہیں نا، چلو میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھادوں۔''

فاخرہ کو ایک جھٹکا لگا اور فوراً کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی، یہ الفاظ اُس کو پہاڑوں کی بلندی سے نیچے دھکیلنے والے لگے۔

فاخرہ نے کہا، ''بہن آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں وہ نہیں ہوں جس کی آپ کو تلاش ہے۔ یہاں چند لمحوں کے لیے رُکی ہوں اور اپنے بیٹے عرشان کا انتظار کر رہی ہوں۔''

وہ لڑکی جو فاخرہ سے مخاطب ہوئی تھی وہ فاخرہ سے نظریں ملا نہیں پائی اور جُھکی نظروں سے اداس لہجے میں کہنے لگی کہ'' بہن فاخرہ! تمھارا بیٹا عرشان تمھیں ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑ گیا ہے۔ ہمارے دفتر سے اُس نے تمھاری یہاں رہائش کے سارے کاغذات مکمل کر لیے ہیں اور ابھی وہ تمھارا سامان دے کر گیا ہے۔'' اُس لڑکی کے ہاتھوں جب فاخرہ نے اپنا بیگ دیکھا تو لرز اُٹھی اور کربناک آواز میں چلائی۔

''نہیں نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، میرا بیٹا کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ میں ایک پل کے لیے بھی اِس عمارت میں رُک کر اپنے بیٹے پر بدنامی کا سیاہ داغ آنے نہیں دوں گی۔ دل دہلا دینے والی چیخ کے ساتھ فاخرہ زمین پر گر پڑی لڑکی جو اِس عمارت میں اُن عورتوں کی نگرانی پر معمور تھی دوڑی ہوئی آئی اور فاخرہ کو ہلایا، مگر یہ کیا؟ فاخرہ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

جاتے جاتے وہ اپنے بیٹے کو سرخرو کر گئی تھی۔

ڈیوٹی پر معمور لڑکی نے عرشان کا فون نمبر لگایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

''ہیلو! کہیے! میں عرشان بول رہا ہوں،'' لڑکی نے گھمبیر آواز میں کہا۔ ''مسٹر عرشان! تمھاری ماں نے اس جگہ اڈمیشن تو کیا ایک پل بھی رہ کر تمھیں بدنام کرنا نہیں چاہا۔ اب تم آزاد ہو۔ آؤ اور اپنی ماں کی ڈیڈ باڈی لے جاؤ۔ یہ زحمت بھی گوارا نہ ہو تو کہہ دینا ہمارا عملہ ہی اُس کے آخری سفر کے کام کو سرانجام دے دے گا۔''

□□□

K.Farhath Jabeen
66,Gundu Ibrahim Sb
Street,6th Cross,
Yasenabad,Muslimpur
Vaniyambadi
Distt. Tirpatur-635751 (TN)

ڈاکٹر جوہی بیگم شاما

غزلیں

دے میری نواؤں میں اثر اور زیادہ
لفظوں کو برتنے کا ہنر اور زیادہ

کچھ تو مری بے لوث محبت کا بھرم رکھ
للّٰلہ یوں بیداد نہ کر اور زیادہ

تجھ کو نظر انداز کیا جب کبھی میں نے
اُٹھتی ہے تری سمت نظر اور زیادہ

ہمت کو شجاعت کو زرہ اپنی بنا لے
دنیا کے مظالم سے نہ ڈر اور زیادہ

اس دہر سے ظلمت کا ہر اک نقش مٹا دے
باطل سے ہو تو سینہ سپر اور زیادہ

شاہین ہے تو کب تری پرواز رکی ہے
کرنا ہے ابھی تجھ کو سفر اور زیادہ

شآما پہ ترا لطف و کرم ہوتا ہے جب بھی
جھکتا ہے ترے سجدے کو سر اور زیادہ

بے زمان و مکان لگتا ہے
یہ سفر بے نشان لگتا ہے

چیخ اُٹھتا ہے ضرب لگتے ہی
جو شجر بے زبان لگتا ہے

میرے اپنوں کی مہربانی سے
گھر بھی مجھ کو مکان لگتا ہے

بخش دیتا ہے پھر نیا اک غم
جب بھی وہ مہربان لگتا ہے

آپ کے ایک روٹھ جانے سے
روٹھا روٹھا جہان لگتا ہے

مشکلوں کے سفر میں ساتھ ترا
دھوپ میں سائبان لگتا ہے

زندگی وسوسوں کی زد میں ہے
ہر بشر بدگمان لگتا ہے

اپنی بستی سے مجھ کو کیوں شآما
دشت یہ پر امان لگتا ہے

Dr. Joohi Begum
59C/67C, South Malaka
Prayagraj 211003
Ph. 07985982665

ہاجرہ خاتون

متاع جاں

بچھڑنے والے
تو بھی اسیر عشق ہو
تجھ پر بھی خزاں رت ٹھہر جائے
محبت میں کبھی
یوں بھی ہو
کہ تو لوٹ کر آئے
اور میں منتظر نہ رہوں
میں تجھ کو بھول جاؤں
اور یہ زیست
رائگاں نہ لگے
خدا کرے کہ
میری طرح
تجھے بھی
ماں کی دعا نہ لگے

پیلی بارش

زندگی کھنکھناتی تھی
ہر رنگ میرا تھا
ہر رنگ میں دھنک تھی
جگنو میری پگڈنڈیاں تھے
روشن دیئے کا اک بام تھا
اور۔۔۔
اور اب
زندگی تو کیا
چوڑی تک نہیں کھنکتی
میری پیلاہٹ نے
ہر رنگ کو پیلا کر دیا
ایسی پیلی بارش برسی
صحیفے محبت کے
جزدانوں سے نکل کر
سرپھری ہوا کا رزق بنے

Dr. Hajra Khatoon
1C Zuleikha Enclave,
Parastoli, Doranda,
Ranchi-834002
Mobile No-9430254770

لذیذ پکوان

ڈرائی فروٹ کیک

اجزا: میدہ 250 گرام، مکھن 100 گرام، دودھ حسب ضرورت، چینی 125 گرام، نمک ایک چوتھائی چائے کا چمچہ، بیکنگ پاؤڈر دو چائے کے چمچے، بادام پستہ بھگو کر چھیل لیں، پندرہ پندرہ گرام، کشمش (دھو کر صاف کر لیں) پندرہ گرام، اخروٹ گری پندرہ گرام، انڈا تین عدد

بنانے کی ترکیب: مکھن میں چینی اچھی طرح پھینٹیں یہاں تک کہ دونوں یک جان ہو جائیں۔

اب انڈا شامل کر کے مزید خوب اچھی طرح پھینٹیں۔ اب میدہ، بیکنگ پاؤڈر، نمک بادام، پستہ اخروٹ اور کشمش شامل کر کے سانچے میں انڈے مومی کاغذ (Vaxpaper) لگا کر آمیزہ ڈال دیں۔

43 ڈگری فارن ہائٹ پر ڈیڑھ گھنٹے اوون میں پکائیں۔

گاجر کی کھیر

اجزا: کدوکش گاجریں ایک کپ، دودھ ایک کلو، پسی ہوئی الائچی چار عدد، کھویا ایک کپ، چینی حسب پسند، چھلکا اترے ہوئے بادام 10 عدد

بنانے کی ترکیب: تھوڑے سے پانی میں گاجروں کو گلا لیں۔

اب دودھ ڈال کر پکائیں ذرا گاڑھی ہونے لگیں تو ہاتھوں سے مل کر کھویا ڈال دیں۔

الائچی اور کٹے ہوئے بادام ڈال دیں۔ ٹھنڈا کر کے نوش کریں۔

چھوہاروں کا حلوہ

اجزا: چھوہارے آدھ کلو
دودھ ایک لیٹر
بالائی ایک پاؤ، چینی تین پاؤ
لونگ دو عدد
کیوڑہ ایک بڑا چمچ، بادام کی گری ایک چھٹانک
سبز الائچی چند دانے، گھی ایک پاؤ
زعفران پسی ہوئی آدھی چٹکی

بنانے کی ترکیب: چھوہاروں کو دھو کر ٹکڑے کر لیں اور گٹھلیاں نکال پھینکیں۔
انھیں ایک دو گھنٹے تک دودھ میں بھگویا رہنے دیں۔ پھر اسی دودھ میں پکالیں۔
گل جائیں تو اتار لیں اور ٹھنڈا ہونے پر دودھ سے نکال کر پیس لیں۔
پتیلے میں گھی سرخ کریں اور سبز الائچیاں اور لونگ ڈال کر بھونیں۔
اسی میں پسے ہوئے چھوہارے بھون لیں اور دودھ بھی ڈال دیں۔
بالائی کو پھینٹ کر چینی سمیت ڈال دیں بادام ڈالیں اور چمچ چلاتے رہیں۔
آنچ ہلکی رکھیں دودھ اور چینی کا شیرہ جب گاڑھا بن کر جذب ہونے لگے تو زعفران کو کیوڑے میں ملا کر ڈال دیں۔
حلوہ گاڑھا ہو جائے اور گھی چھوڑنے لگے تو اتار لیجیے۔
چند منٹ تک ڈھکا پڑا رہنے دیں۔ ایک طباق میں حلوہ نکال لیں۔
چاندی کا ورق، بادام کی باریک گریاں اور گلاب کی پتیاں حسب ذوق چھڑک لیں۔

شاہی سویاں

اجزا: دودھ ایک لیٹر
رنگین سویاں ایک کپ (ابلی ہوئی)
کسٹرڈ پاؤڈر دو کھانے کے چمچ
کنڈینسڈ ملک ایک ٹن
ہری جیلی ایک پیکٹ
لال جیلی ایک پیکٹ، کریم ایک پیکٹ
عرق گلاب ایک کھانے کا چمچ
آئس کریم آدھا لیٹر
فروٹ کوکٹیل ایک ٹن، کھویا ایک کپ، بادام، پستے حسب ضرورت، چاندی کے ورق دو عدد

بنانے کی ترکیب: پہلے دودھ کو پکنے کے لیے رکھ دیں۔
جب ابال آجائے تو اس میں رنگین سویاں اور کسٹرڈ پاؤڈر ڈالیں اور چولہا بند کر کے کنڈینسڈ ملک مکس کریں اور فریج میں اچھی طرح ٹھنڈا کر لیں۔
اب ہری جیلی اور لال جیلی کو الگ الگ جما کر ٹکڑے کر لیں۔
پھر ٹھنڈی سویوں میں کریم اور عرق گلاب ڈالیں اور آئس کریم ٹرے میں رکھ کر فریج میں جما دیں۔
اس کے بعد آئس کریم پر سویاں اور فروٹ کوکٹیل ڈال دیں۔
ساتھ ہی کوکٹیل کا جوس بھی شامل کریں۔
آخر میں کھویا جیلی کے ٹکڑے، بادام، پستے ڈالیں اور چاندی کے ورق لگا کر سرو کریں۔

(بحوالہ: میٹھا دسترخوان، آذین غوث، سنہ اشاعت 2019، مکتبہ امام اعظم، دہلی)

□□□

ڈاکٹر صدف کلام

اینٹی آکسیڈنٹس
قدرت کی اکسیر

عظیم یونانی معالج ہپوکریٹس(Hippocrates) نے400 قبل مسیح کہا تھا کہ ”غذا کو اپنی دوا بناؤ اور دوا کو اپنی غذا“۔

اچھی ذہنی اور جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے آج اچھی غذا نہایت ضروری ہے۔ آج دنیا میں موت کی دس بڑی وجوہات میں سے کم از کم چار وجوہ براہِ راست ہماری طرزِ غذا سے متعلق ہیں۔ موت کی چار بڑی وجوہ امراضِ قلب(Heart Disease)، سرطان(Cancer)، لقوہ(Stroke) اور ذیابطیس(Diabetes) ہیں۔ تغذیہ کے اعتبار سے ناقص اور نامناسب غذا جسم کے لیے نہ صرف نقصان دہ ہوتی ہے بلکہ متعدد مسائلِ صحت مثلاً احساسِ بیچارگی (Depression)، قبل از وقت معمر ہونا(Ageing) اور دیگر دائمی بیماریاں(Chronic Diseases) لاحق ہو سکتی ہیں۔ ایک شخص جو صحت مند رہنا چاہتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اینٹی آکسیڈنٹس سے پُر غذا لے۔ اینٹی آکسیڈنٹس زندگی کے اکسیر اور محافظ ہوتے ہیں نیز یہ اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ ہم خطرناک بیماریوں کے شکار نہ ہونے پائیں۔

ہماری غذا اینٹی آکسیڈنٹس سے پُر ہونی چاہیے، کیوں کہ یہ زندگی کی قدرتی اکسیر (Natural Elixir of Life) ہوتی ہیں، جنھیں زندگی کے محافظ (Life Saviors) بھی کہا جاتا ہے، جو یقینی طور پر ہمیں خطرناک بیماریوں کا شکار ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں۔

اینٹی آکسیڈنٹس ایسے سالمات (Molecules) ہوتے ہیں، جو دوسرے سالمات کے آکسیڈیشن (Oxidation) کو روکتے ہیں۔ فری ریڈیکلس(Free Radicals) خطرناک طور پر ہمارے خلیے کو نقصان پہنچانے کی قوت رکھتے ہیں۔ فری ریڈیکلس ایسے ایٹم ہوتے ہیں، جو جسم کے خلیوں، لحمیوں(Protein) اور DNA کو بہت زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ صحت مند خلیوں پر حملہ بول کر ایک سلسلے وار ردِعمل (Chain Reaction) انجام دیتے ہیں، جس سے مختلف خلیوں کی ساخت اور کارکردگی(Functional Structure) پر بہت زیادہ منفی اثر پڑتا ہے، بالآخر خلیے کی سالمیت (Integrity) نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ آکسیڈیشن ایک ایسا کیمیائی عمل(Process) ہے، جو خطرناک سلسلے وار ردِعمل(Chain Reaction) انجام دیتا ہے، جس سے جسم کے ریشے(Tissue) کے سارے خلیے ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن اینٹی آکسیڈنٹس وہ کرشماتی سالمات(Molecules) ہیں، جو نہ صرف آکسیڈنٹس کے نقصانات سے ہمیں بچاتے ہیں بلکہ تمام خطرناک بیماریوں سے محفوظ بھی رکھتے ہیں۔

Antioxidants دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ Antioxidants آتے ہیں، جو باہر سے تمام غذاؤں میں ڈالے جاتے ہیں تاکہ Oxidants کے مہلک اثرات سے غذاؤں کو بچایا جا سکے، جنھیں صنعتی کیمیائی مادّے(Industrial Chemicals) کہتے ہیں۔ دوسری قسم میں قدرتی کیمیائی مادّے (Natural Chemicals) آتے ہیں، جو قدرتی طور پر ہماری غذا میں پائے جاتے ہیں اور ہماری صحت کے لیے فائدے مند ہوتے ہیں۔

اینٹی آکسیڈنٹس کیا ہیں؟

☆ انھیں پہلی خطِ دفع (First Line of Defence) کہا جاتا ہے، جو ہمارے جسم کو فری ریڈیکلس (Free Radicals) کے حملے سے بچاتے ہیں۔

☆ یہ وہ دفاعی ایجنٹس(Agents) ہیں، جو فری ریڈیکلس کو غیر کارکرد(Deactivate) بنا دیتے ہیں۔

☆ یہ ہمارے جسم کو ریڈیکلس کی وجہ سے ہونے والی آکسیڈیٹو اسٹریس (Oxidative Stress) سے بچاتے ہیں۔

اینٹی آکسیڈنٹس ایسے طاقتور مادّے ہیں، جو تازہ پھلوں اور سبزیوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ مرکبات(Compounds) بڑے مقوی ہوتے ہیں، جو جسم کو خلوی ضرر(Cellular Damage) سے محفوظ رکھتے ہیں۔

United States Department of Agriculture

(USDA) کے سائنسدانوں نے قریب سو مختلف غذاؤں، جن میں پھل اور سبزیاں شامل ہیں، پر تجربہ (Experiment) کر کے اینٹی آکسیڈنٹس کی مقدار/ارتکاز کا پتہ لگایا ہے۔ تمام پھلوں اور سبزیوں کی فی خوراک (Per Serving Size) میں اینٹی آکسیڈنٹس ارتکاز (Antioxidant Concentration) اور اینٹی آکسیڈنٹس قوت (Antioxidant Capacity) کو ناپا گیا۔ جس سے یہ واضح ہوا کہ مختلف اقسام کی بیریز جیسے کران بیریز (Cranberries)، بلو بیریز (Blueberries)، راسپ بیریز (Raspberries)، بلیک بیریز (Black Berries) میں سب سے زیادہ Antioxidants پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح سبزیوں میں، پھلیوں (Beans) میں، ہاتھی چوک (Artichoke) میں بھی خاصی مقدار میں اینٹی آکسیڈنٹس پائے جاتے ہیں۔ میووں کی قسموں میں امریکی اخروٹ (Pecans)، اخروٹ (Walnuts)، کشمیری بادام (Hazelnuts) وغیرہ اینٹی آکسیڈنٹس کے بہترین ذرائع ہیں۔

سبھی پھلوں اور سبزیوں میں، مختلف قسموں کی بیریز، بین، بروکلی (Broccoli)، بند گوبھی (Cabbage)، پالک (Spinach)، بینگن (Eggplant) اور پھلیاں؛ جیسے راجما (Red Kidney Beans) یا بلیک بینس (Black Beans) میں اینٹی آکسیڈنٹس کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے، اور یہ ہمارے جسم کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ USDA کے عظیم سائنسدان رونالڈ ایل پرائر Ronald L. Prior کے مطابق کسی غذا کی مکمل اینٹی آکسیڈنٹس قوت (Antioxidant Capacity) لازمی نہیں کہ صحت سے متعلق فائدوں کی عکاسی کرے۔ صحت سے متعلق فائدوں کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ غذا میں پائے جانے والے اینٹی آکسیڈنٹس کس طرح جسم میں جذب اور استعمال ہوتے ہیں۔

چائے

کالی چائے بنام ہری چائے (Black Tea v/s Green Tea)

دونوں قسم کی چائے میں ایک اہم اینٹی آکسیڈنٹ مرکب (Antioxidant Compound) پایا جاتا ہے، جسے Epigallocatechin Gallate (EGCG) کہتے ہیں، جو ایک اعلیٰ درجے کا اینٹی آکسیڈنٹ ہوتا ہے۔

کالی چائے میں درج ذیل اہم اجزا پائے جاتے ہیں:

1۔ تھیا فلاوینس (Theaflavins) جو نارنگی رنگ کے پگمینٹس ہوتے ہیں۔

2۔ تھیاروبیجنس (Thearubigins) جو لال رنگ کے پگمینٹس ہوتے ہیں۔

ہری چائے میں پالی فنالس (Polyphenols) اور فلیوونوئیڈس (Flavonoids) پائے جاتے ہیں۔ یہ مرکبات (Compounds) جسم کے لیے مفید ہوتے ہیں اور Cholesterol کے Level کو کم کرتے ہیں۔

ہمارے جسم میں Free Radicals کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے جسم میں ایک صحت بخش توازن (HealthyEqulibrium) کو بنائے رکھنے کے لیے باہری ذرائع (External Sources) سے ان کی کمی کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

یہ مرکبات (Compounds) ہمارے مُدافعتی نظام (Immune System) کے لیے معاون ہوتے ہیں۔ ہری چائے کیلوری کو جلا کر وزن کم کرنے میں بھی مدد کرتی ہے۔ علاوہ ازیں سرطان جیسی موذی بیماری کو روکنے میں بھی مددگار رہتی ہے۔

اینٹی اوکسیڈنٹس کی درجہ بندی (Classification of Antioxidants)

اینٹی آکسیڈنٹس کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1۔ Nutrient Derived: یہ مرکبات ہمارے کھانے میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں، جو کھانے کے ساتھ ہمارے جسم میں چلے جاتے ہیں اور جذب ہو جاتے ہیں۔

2۔ Antioxidant Enzymes: یہ ہمارے جسم میں پائے جاتے ہیں اور حسب ضرورت استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

3۔ Metal Binding Proteins: یہ پروٹینس جسم میں پہلے ہی سے پائے جاتے ہیں؛ جیسے Ferritin Protein جو خون میں پایا جاتا ہے اور جسم میں Iron کو بنائے رکھنے میں مددگار رہتا ہے۔

4۔ Phytonutrients: لفظ فائٹو (Phyto) پودے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ غذائی اجزا (Nutrients) ہری سبزیوں اور پھلوں

میں پائے جاتے ہیں؛ جیسے Raspberry یا Strawberry میں Flavonoids ہوتے ہیں۔

ان تمام اینٹی آکسیڈنٹس سے ہمارے جسم کو لاحق تمام بیماریوں سے لڑنے کی طاقت آتی ہے، جس سے انسان نہ صرف بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے بلکہ ممکنہ خطرات سے بھی بچا رہتا ہے۔

انار: ایک اہمیت پذیر اعلیٰ پھل
(Pomegranate:A Rising Super Fruit)

انار ایک بہت ہی مفید پھل ہے، جس کا ذکر قرآن کریم میں سورۃ الانعام کی آیت 99 اور سورۃ الرحمٰن کی آیت 68 میں آیا ہے۔ سائنسی تجربوں سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ ایک گلاس انار کا جوس اگر ایک سال تک روزانہ لیا جائے تو Blood Pressure ہی نہیں بلکہ خراب Cholesterol بھی کم ہو جاتا ہے۔ ان تمام تجزیوں (Analysis) سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انار میں صحت کے لیے مفید اینٹی اوکسیڈنٹ مرکبات؛ جیسے Polyphenols,Tannins اور Anthocyanins ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ انار میں Punicalagin نام کا اہم اینٹی آکسیڈنٹ مرکب بھی ہوتا ہے۔ یہ اینٹی آکسیڈنٹ مرکبات خراب LDL Cholesterol کو کم کرتے ہیں اور جسم کے Cadiovascular system کو مضبوط بنائے رکھنے میں بھی مدد کرتے ہیں۔ خواتین میں Menopause سے ہونے والے خراب اثرات کو کم کرنے میں بھی معاون ہوتے ہیں۔

فلیوہ نوئیڈس اہم اینٹی آکسیڈنٹ کا مجموعہ ہے، جو مختلف قسم کے پھلوں اور پودوں کی جڑوں اور شاخوں میں پائے جاتے ہیں، علاوہ ازیں مختلف قسم کی بیریز، چائے، دال، گیہوں اور سبزیوں میں بھی ملتے ہیں۔ ان کو Super Antioxidant کہا جاتا ہے۔ ان کی بہت سی خوبیاں درج کی گئی ہیں؛ مثلاً یہ Antiviral,Antiallergic, Anti-Inflammatory, Antithrombogenic, اور Anticarcinogenic ہوتے ہیں۔ یہ صفائی کنندہ (Scavenger) ہوتے ہیں اور مختلف Free Radicals کو صاف کر دیتے ہیں جس سے خلیے کی ساختی سلیت (Structural Integrity) برقرار رہتی ہے۔ ان کی تعداد 4000 سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

انار میں بھی فلیوہ نوئیڈس پائے جاتے ہیں؛ جیسے Catechins, Ellagic acid, Tannins, Gallic acid یہ سارے کمپاؤنڈس انسانی جسم میں پھیپھڑے سرطان (Lungs Cancer) اور مسانہ سرطان (Prostate Cancer) کے خلیوں کو بڑھنے سے روکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی اینٹی مائکروبیل اور اینٹی وائرل خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔

Oligomeric Proanthocyandins (Bioflavanoids)

یہ بہت ہی اہم اینٹی آکسیڈنٹ مرکبات ہوتے ہیں، جن کا ذکر قرآنِ کریم میں سورۃ عبس کی آیت 28 میں آیا ہے۔ یہ اینٹی آکسیڈنٹس Vitamin C سے بیس گنا اور VitaminE سے پچاس گنا زیادہ طاقتور ہوتے ہیں، جو پانی میں گھل جاتے ہیں۔ اوپر کی تصویر میں مختلف انگور Bioflavanoids کے متمول وسائل (Rich Sources) ہیں۔

ان کی اہم خوبی یہ ہے کہ یہ 72 گھنٹوں تک جسم کے لحمیوں (Proteins) سے جڑے رہتے ہیں اور انھیں Oxidize ہونے سے محفوظ

رکھتے ہیں۔ یہ Blood Brain Barrier کو بھی پار کرنے کی قوت رکھتے ہیں اور عصبی نظام (Nervous System) کو مضبوط رکھنے میں بھی مدد کرتے ہیں۔ یہ اینٹی آکسیڈنٹس آنکھوں میں پائے جانے والے Eye Fluid کے اثر کو برقرار رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں Ultra Violet Rays سے آنکھوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ نہایت اہم اینٹی آکسیڈنٹس انگور میں وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مونگ پھلی کے چھلکوں اور بعض پھلوں میں بھی دستیاب ہوتے ہیں۔

اچھی صحت کے لیے اور دائمی بیماریوں (Chronic Diseases) سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ذیل میں پیش کی گئی چیزوں سے پرہیز کیا جائے؛

1۔ مُعمّل کھانے (Processed Foods)

2۔ زیادہ جلائے ہوئے کھانے (Highly Barbequed Foods)

3۔ زیادہ تلے ہوئے کھانے (Deep Fried Food)

4۔ زیادہ چربی والی پیسٹری اور بیکری میں بننے والے کھانے (Baked Food)

5۔ زیادہ نمک والے کھانے (Highly Salted Food)

6۔ زیادہ شکر والے کھانے (Canned Foods)

7۔ سرخ گوشت (Red Meat)

نیچے دیے گئے پھلوں اور سبزیوں کو اپنی غذا میں شامل کرنے سے صحت مکمل طور پر اچھی ہوگی؛

1۔ تازہ اور غیر مُعمّل غذا (Fresh & Unprocessed Foods)

2۔ تازہ پھل اور سبزیاں (Fresh Fruits and Vegetables)

3۔ ریشے دار غذا (Fibrous Foods)

4۔ خشک میوے (Dry Fruits)

سبز غذا کے بہت سے فائدے ہیں، بشرطیکہ اس میں صحیح مقدار میں لحمیات (Proteins) اور، گری دار میوے (Nuts) ہوں۔ کابلی چنا اور راجما Antioxidant کے بہترین ذرائع ہیں۔

فری ریڈیکلس کے خطرناک اثرات

فری ریڈیکلس (Free Radicals) سے بچنے کے لیے Antioxidants کا ہماری روزانہ کی غذا میں شامل ہونا لازمی ہے۔ ہماری رسمی ہندوستانی غذائیں (Traditional Indian Diets)، مصالحہ (Spices) اور طبی پودے (Medicinal Plants) اینٹی آکسیڈنٹس کے بہترین اور مفید ذرائع ہیں۔

عصرِ حاضر میں ہمارا جسم کبھی بھی بیماریوں کی زد میں آسکتا ہے لہٰذا اس سے بچنے کے لیے قدرتی اشیائے خوردنی (Natural Products) ایک عظیم خزانہ ہیں، جنھیں ہماری روزمرّہ کی غذا کا لازمی حصہ ہونا چاہیے۔

ان جادوئی اور کرِشماتی کمپاؤنڈس کا غذا میں اضافہ نہ صرف ہماری میعادِ زندگی کو بڑھائے گا بلکہ معیارِ زندگی کو بھی بہتر بنائے گا۔

☆☆☆

Dr.Sadaf Kalam
Associate Professor
Department of Biochemistry
Coordinator, DBT Star College Scheme
St. Ann's College for Women,
Mehdipatnam, Hyderabad
Telangana-500032
Cell No: 09502403852

حسن کی نگہداشت

ہلدی سے نرم و ملائم بے داغ اور چمکدار جلد

بالوں کی خشکی کے لیے

حسب ضرورت زیتون کے تیل میں تھوڑی سی ہلدی ملا کر اس مکسچر کو سر کی کھوپڑی پر لگائیں اور پندرہ منٹ لگا رہنے کے بعد کسی اچھے اور معیاری شیمپو سے سر دھولیں۔

چھائیوں کے لیے

ہلدی اور لیموں کے مکسچر کو چہرے کے متاثر حصے پر لگائیں اور بیس منٹ کے بعد منہ دھولیں۔

مردہ خلیات کے لیے: تھوڑے سے جو یا مکئی کے آٹے میں آدھا

چمچ ہلدی پاؤڈر اور پانی شامل کر کے اس کا پتلا سا پیسٹ بنالیں اور اسے جسم پر لگا کر آہستگی کے ساتھ اسکرب کریں اس پیسٹ کو نہاتے وقت لگائیں اس کا باقاعدہ استعمال نہ صرف مردہ خلیات کو ہٹانے میں معاون ثابت ہوگا بلکہ اس سے جلد بھی نرم وملائم بے داغ اور چمکدار ہوجائے گی۔

قدرتی کلینزر

تھوڑے سے کچے دودھ میں چٹکی بھر ہلدی ملا کر اسے اپنے چہرے اور ہونٹوں پر لگائیں ہلدی اور دودھ کا مکسچر چہرے پر قدرتی کلینزر کا کام کرے گا اور خشک اور پھٹے ہوئے ہونٹوں کو نرم وملائم اور گلابی بنادے گا۔

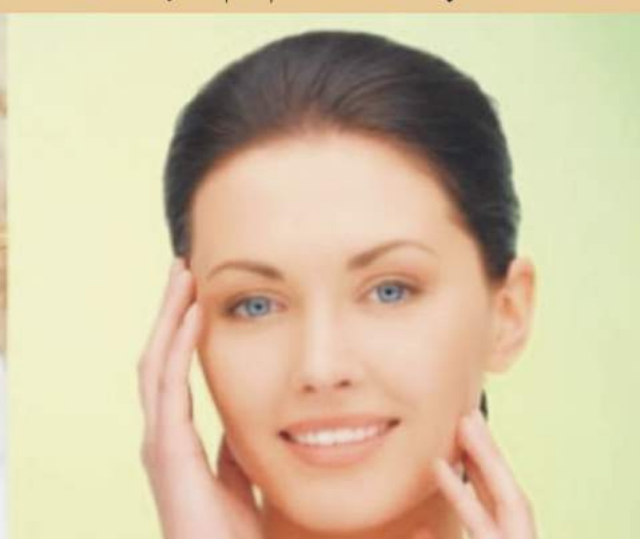

جلد میں چمک کے لیے

تھوڑے سے صندل پاؤڈر میں چٹکی بھر ہلدی اور چند قطرے کھانے پکانے کا تیل شامل کر کے اس کا پیسٹ بنائیں اب اس پیسٹ کو چہرے پر لگائیں اور تقریباً پندرہ یا بیس منٹ کے بعد تھوڑے پانی سے منہ دھولیں، چہرے پر بلا کی چمک پیدا ہوجائے گی۔

پھٹی ہوئی ایڑیوں کے لیے

پھٹی ہوئی ایڑیوں کے لیے تین کھانے کے چمچ ہلدی میں ایک چمچ ناریل کا تیل یا کسٹر آئل ڈال کر اس کا پیسٹ بنائیں اور اسے ایڑیوں پر لگائیں اس سے نہ صرف ایڑیاں صحت مند ہوں گی بلکہ ان کے پھٹنے کی وجہ سے ہونے والے درد کو بھی فوری سکون اور آرام ملے گا۔ اس کے علاوہ اس قدرتی نسخے کا استعمال انگلیوں کے درمیان پیدا ہونے والے انفیکشن کو بھی روکنے میں مدد دیتا ہے۔ اس نسخے کو اس وقت تک استعمال کریں جب تک ایڑیاں اچھی حالت میں نہ آجائیں۔

(بحوالہ:www.tipsinurdu.blogspot.com)

تاثرات: نگر نگر سے

"خواتین دنیا" اکتوبر 2021 دستیاب ہوا۔ سرورق سے ہی یہ خوشگوار احساس ہوا کہ یہ بابائے قوم مہاتما گاندھی جی کے نام معنون ہے۔ مہاتما گاندھی کی عظمت کا ایک زمانہ معترف ہے اور ساری قوم عقیدت سے سرشار ہے۔ جہاں تک نسوانی تحفظ وترقی کا مسئلہ ہے تو مہاتما گاندھی نے نہ صرف ان کی حمایت کی ہے بلکہ اپنی شہادت تک ان کا ساتھ نبھایا۔ ایسے واقعات کو یاد کر کے آنکھیں پُرنم ہوجاتی ہیں۔ بہرحال 2 اکتوبر یعنی مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش ساری دنیا کے انسانوں کے لیے مبارک ساعت ہے۔

اداریہ (ص4) کے علاوہ اس عظیم شمارہ میں 9 شہ سرخیاں ہیں جن کے تحت تقریباً 18 ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں جو اس شمارے کے مشمولات کی ترتیب ہیں۔ "شخصیت" (ص5 تا10) کے ذیل میں ڈاکٹر مسرت نے محترمہ ساجدہ زیدی کی منظوم کائنات کا جائزہ لیا ہے۔ اس شاہکار کی مصنفہ اور موضوع سے ایک عالم بخوبی واقف ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ تجزیہ بڑی باریک بینی سے لیا گیا ہوگا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ آپ مقالہ پڑھ کر دیکھیے۔ تمام تر عبارت میں آپ کو مدلل معروضی کیفیت نظر آئے گی کہ ساجدہ زیدی کی شاعری میں حقیقی حوادث وواقعات سموئے گئے ہیں۔ ان کی شاعری میں عورت کے دکھ، اس کی الجھنیں، ان کا حل (ممکن یا غیر ممکن) سب کچھ شامل ہیں۔ ایسی کیفیت اور ایسے جذبات کو آپ کیا نام دیں گے؟ یہ آپ کو سوچنا ہے۔ "جہانِ نسواں" (ص11 تا ص44) میں کوئی 8 مقالے شامل ہیں۔ تمام ہی منتخب اور چنندہ موضوعات ہیں، یعنی قابل مطالعہ جو کہ علم میں اضافہ کا باعث بن جائیں۔ ان میں "ممتاز صدیقی" (ص11) اور مصنفہ میں ماں جائی کا رشتہ ہے۔ پھر بھی مصنفہ نے حقائق کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ اس کے علاوہ "منی بائی....." (ص17) "تامل ناڈو میں اردو لوک گیت" (ص23) بھی بہت خوب ہے لیکن "اردو رپورتاژ نگاری...." (ص32) تو بڑے خاصہ کی چیز ہے۔ اس موضوع پر مصنف نے بڑی عرق ریزی کی ہے اور پھر نمائندہ خواتین کی جو مقتدر اور معتبر فہرست پیش کی وہ اسی فاضل مصنف کا حصہ ہے۔ اس تحقیقی اور تجزیاتی مقالہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

"نکہت سخن" (ص45) میں کوئی آٹھ شاعرات کا عمدہ کلام پیش کیا گیا ہے۔ ان میں یوں تو سبھی کا کلام دلکش ہے، لیکن ادا جعفری اور ساجدہ زیدی کے اشعار پسند آئے۔ "افسانہ" (ص46 تا 51) کے تحت دو اچھے افسانے درج ہیں۔ "زخمی احساس" (ص46) میں حالیہ وباء کی زیادتی کو بڑی خوبی سے سمویا گیا ہے۔ جبکہ دوسرے افسانے (نرگس آپا) میں شوہر کی زیادتی کا ذکر ہے۔ "حسنِ سخن" (ص52 اور 53) میں دو غزلیں اور ایک آزاد نظم ہے۔ پہلی غزل غالب کے ایک مصرعہ کی طرحی غزل ہے لیکن اس کا قافیہ ذرا ڈانوا ڈول لگ رہا ہے۔ "باورچی خانہ" (ص54 اور 55) لذیذ پکوانوں کی ترکیب وتصاویر کا مرقع ہے۔ یہ پکوان صحت مندی کے ضامن ہوسکتے ہیں مگر "صحت" (ص56 تا 58) پر نظر ڈالتے ہی ایک گھبراہٹ سی طاری ہوگئی کہ اس کے ذیل میں سرطان اور اس کی قسموں نے سٹی گم کردی۔ اللہ اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔ "آرائش وزیبائش" (ص59 اور 60) خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے جتن سے آگاہ کیا گیا ہے۔ "تاثرات" (ص61 اور 62) میں دو خطوط شامل ہیں۔ اس بے نظیر شمارے کے بارے میں بس یہی کہا جاسکتا ہے بقول فیض ؎

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

مصطفی ندیم خان غوری، زرّین ولا، بی-۱۱، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، (مہاراشٹرا)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہمایوں نامہ

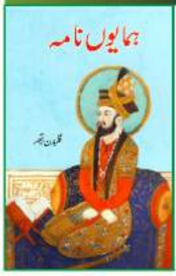

مصنف: گلبدن بیگم

چھٹی اشاعت: 2021

صفحات: 92

قیمت 55 روپے

دامان مریم

مصنف: محمد حسن، تحقیق وترتیب: جمیل اختر

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 192

قیمت: 160 روپے

اردو-ہندی لغت

ایڈیٹر: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ

کوآرڈینیٹر: مسرت جہاں

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 416، قیمت: 125 روپے

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

مصنف: حنیف کیفی

چوتھی اشاعت: 2021

صفحات: 580

قیمت 270 روپے

کلیات امور طبیعیہ

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 288

قیمت: 145 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, दिसम्बर-२०२१ वर्ष: ५, अंक: १२
Mahnama Khawateen Duniya Monthly December 2021, Vol. 5, Issue:12
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India
RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-12-2021
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6